GOD AS TRIUNE

CREATOR, INCARNATE, ATONER

Rev. W.H.T. GAIRDNER

خدا کی جہاتِ ثلاثہ

یعنی

خدائے خالق، خدائے مجسم، خدائے نجات دہندہ

علامہ ڈبلیو۔ایچ۔ٹی۔ گیرڈنر صاحب بی۔اے

1967

باب اول

باب دوم

باب سوم

باب چہارم

باب اوّل

پہلا اعتراض ۔خدائے مسیحیت

گو یہ ممکن ہے کہ ہم اس باب میں مسئلہ تثلیث فی التوحید کے ثبوت ازروئے کلام اللہ پیش کریں اور نیز ایسے تورایخی ثبوت بہم پہنچائیں جن سے یہ ثابت ہوجائے کہ ابتدا سے مسیحی کلیسیا اس عقیدہ کی متعقد رہی ہے لیکن چونکہ اکثر مصنفین نے ایسا کیا ہے کہ اس لئے ہم ان دلائل کو دہرانا نہیں چاہتے ۔ علاوہ ازیں ہم اہل اسلام کے خلاف تثلیث حملوں کو نہ صرف بعید ازل عقل خیال کرتے ہیں بلکہ خلاف کلام الہیٰ بھی تصور کرتے ہیں ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس مسئلہ کو خلاف عقل ٹھہرانا نہ صرف مسئلہ ہائے تجسم وکفارہ کا جو اس مسئلہ سے وابستہ ہیں قلع قمع کردیتا ہے بلکہ تمام کلامِ خدا کی تکذیب کردیتا ہے ۔ لہذا ہم یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس مسیحی مسئلہ کو خلاف عقل بنا ناعدم موجودگی کی عقل کا ثبوت دینا ہے ۔ اور کہ یہ مسائل اوّل تو خود فلسفیانہ حقائق ہیں اور دوسرے یہ کہ ان سے ایک واحد، پاک اور پیار کرنے والے خدا کی ہستی کا تیقن ایک امر سہل ہوجاتاہے اور وہ تمام مشکلات وشکوک جو اس راہ میں انسان کو پریشان کرتے ہیں یکدم کافور ہوجاتےہیں۔

چنانچہ ہم اس دوگانہ معیار کو سامنے رکھ کر مسئلہ تثلیث فی التوحید کا امتحان کریں گے۔ لہذا پہلے ہم ان تمام فلسفیانہ اعتراضات کا جو تردیدِ تثلیث میں پیش کئے جاتے ہیں۔ جواب دے کر اس کے سراسر معقول ہونے کو ثابت کریں گے پھر یہ ظاہر کریں گے کہ یہ مسئلہ بجائے خدا کی ہستی کے یقین کو مشکل بنانے کے اسے بالکل آسان کردیتاہے ۔

پانچ فلسفیانہ اعتراضات اور ان کے جوابات

1۔الفاظ "باپ" اور "بیٹا" شایانِ شان ایزوی نہیں۔

یہ اعتراض دوحصوں میں منقسم ہوسکتاہے ۔

(1) کہ یہ الفاظ تولید کے جسمانی عمل کی طرف اشارہ کرتےہیں۔

(2) کہ یہ الفاظ زمانہ اور تواتر پر دلالت کرتےہیں۔ اور یہ دونوں امور وحدتِ خدا کے تصور کی بیخ کفی کردیتےہیں۔

لیکن اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو ان اعتراضات کا کھوکھلا پن بہت جلد ظاہر ہوجاتا ہے۔

(1)ضرور ہے کہ آپ " ابوت " اور تولید " کےموضوع میں بڑی احتیاط سے تمیز کریں۔ والد اور باپ مترادف الفاظ نہیں ہیں۔ ہر ایک دنیاوی باپ والد توہے لیکن ہر ایک والد باپ نہیں ہے۔ والد ہونا یاپیدا کرنا ایک ایسا جسمانی عمل ہے کہ انسان اور حیوان میں یکساں پایا جاتاہے بلکہ عالمِ نباتات کے ادنیٰ ترین طبقوں میں بھی جو اپنی نوع کو قائم رکھتےہیں دکھائی دیتاہے۔ لہذا اب آپ روشن ہوگیا ہوگا کہ یہ کہنا فلاں دریائی جانور کا یا فلاں پودا فلاں پودے کا باپ ہے کیا لغو اور بے معنی معلوم ہوتاہے۔ کیا جب آپ باغ میں ایک بیج بونے لگتےہیں تو کبھی یہ سوال بھی رونما ہوتاہے کہ یہ بیج کسی خاص پودے کا بیج ہے یا اس بیج سے کونسا خاص پودا پیدا ہوگا۔

بیان ماقبل سے فوراً ظاہر ہوجاتاہے کہ جب ہم زمینی باپ اور بیٹے کے متعلق بات چیت کرتےہیں تو جسمانی تولید کا خیال ہر گز ہمارے ذہنوں میں مقدم جگہ نہیں رکھتا۔ اس

وقت درحقیقت ہمارے تخیل میں چند خاص اخلاقی کیفیات کا سلسلہ جاگزیں ہوتا ہے۔ اس وقت وہ روحانی تعلق پیش نظر ہوتا ہے جو دو اخلاقی اور روحانی ہستیوں کے مابین پایا جاتا ہے۔ ہم اس اخلاقی سلسلہ کی چند کڑیوں کا ذکر کئے دیتے ہیں۔ محبت جو سب سے زیادہ اہم اور سب سے مقدم ہے ۔ شفقت اور نرمی ،گہری باہمی رفاقت جذباتِ نیک کامل اور پرلطف مبادلہ ۔ماہیت کی یکسانیت ۔صورت وسیرت اور ارادہ کی یکسانیت کام کی یکسانیت اور فرائض کا ربط وتعلق ۔ اس میں شک نہیں کہ یہ خاص متصورہ ابوت اور ابنیت میں پائے جاتے ہیں لیکن میں نے اکثر عالمِ حقیقت میں بھی ایسے تعلقات پورے ہوتے دیکھے ہیں۔

اب ہم پوچھتے ہیں کہ مذکورہ بالا اوصاف میں کوئی ایسی خوبی بھی ہے جو خدا کی شانِ الٰہی کے خلاف ہو؟ کم از کم اخلاقی نکتہ خیال سے تو کوئی ایسا معیوب وصف دکھائی نہیں دیتا۔ البتہ رہا کثرت کا سوال تو اس پر ہم آگے چل کر مفصل بحث کریں گے۔ لیکن یہ ایسے اخلاقی اوصاف ہیں جو ایک پاک اور بے عیب خدا پر بغیر کسی قسم کی کسرِ شان کے عائد ہوسکتے ہیں۔ بلکہ خدا خود ان الفاظ کو استعمال کرتا ہے تاکہ اس رشتہ کی ماہیت اور پوری کیفیت ہمارے ذہن نشین ہوجائے جو اس میں اور اس کے ازلی کلمہ میں پایا جاتا ہے۔ اگر اس قسم کے الفاظ استعمال نہ کئے جاتے توضرور اس عجیب تعلق کو محض حکمت نظری کا جامہ پہنادیا جاتا (جیسا کہ یہودی فیلوسف بنام فائلو PHILO نے کیا) اور اس کی وہ روحانی منزلت جو انسانی روح کی خوشی اور اطمینان کے لئے ضروری ہے بالکل مفقود ہوجاتی ۔ لیکن شکر ہے کہ یہ مسئلہ باپ اور بیٹا اس روح پاک کے ساتھ مل کر جو باپ اور بیٹا دونوں سے صادر ہوتی ہے خاندانی پاکیزگی میں نئی خوبصورتی اور کشش پیدا کردیتا ہے اور جذبات محبت اور رفاقت میں ایک معنی داخل کردیتا ہے بشرطیکہ اسے دماغ سے اتر کر دل کی عمیق گہرائیوں تک سرائت کرجانے کی اجازت دی جائے۔

(2)ہم اعتراض دوم کا ضمناً تجربہ کرچکے ہیں جو ان الفاظ میں تواتر و تسلسل بتلاتا ہے۔ اور بیٹے کو ازیت کے درجہ سے گرادیتا ہے اور خدا کا باپ بننا ثابت کرتا ہے۔

لیکن یاد رہے کہ ہم نے شروع ہی میں اس امر کی پوری تصریح و توضیح کردی ہے کہ تولید کا وصف ایک خالص روحانی شخصیت کے اوصاف میں ہر گز دخل نہیں پاسکتا۔ لہذا تسلسل بھی ناممکن ہے ۔ جب ہم ان اخلاقی معانی پر گہری نظر ڈالتے ہیں جو الفاظ باپ اور بیٹا میں مخفی ہیں تو یہ حقیقت اظہر من الشمس ہوجاتی ہے کہ یہ دونو الفاظ لازم وملزوم ہیں اور ان میں بلحاظ زمانہ تفریق وتمیز کرنا ناممکن ہے ۔ دنیاوی طور پر بھی یہ امر مسلمہ ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک باپ نہیں ہوتا جب کہ اس کا بیٹا معرض وجود میں نہ آجائے۔ اسی حقیقت کو یوں بھی بیان کرسکتے ہیں کہ جب بیٹا پیدا ہوتا ہے تو اسی وقت باپ بھی اپنی پدرانہ حیثیت میں جنم لیتا ہے۔ لہذا خدا میں جس کی ذات ازلی وقت کے اثر سے مبرا ہے باپ اور بیٹا تسلسل سے کہیں زیادہ محفوظ ہیں۔ لہذا بجائے اس کے یہ خیال گذرے کے باپ بیٹے سے بلحاظ زمانہ پیشتر تھا تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ دونوں ہمعصر ہیں اور دونو ازلی ہیں اور جب ہم ایک دفعہ ذاتِ الٰہی میں کسی قسم کے ازلی تعلقات کا امکان مان لیتے ہیں تو پھر انہیں باپ ،بیٹا اور روح (جو باپ اور بیٹے دونو کی روح ہے) کے اسمائے اخلاقی نامزد کرنا کوئی امر مشکل نہیں معلوم ہوتا۔

لیکن مذکورہ بالا تشریح کے بعد بھی یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ مسئلہ اہلِ اسلام کے لئے بڑی ٹھوکر کا باعث ہے اور اسی گہری اور جبلی نفرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو وہ اس مسئلہ سے رکھتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مناسب ہے کہ مسیحی ان الفاظ کو جو کسی وقت اس الٰہی

حقیقت کے اظہار کے لئے استعمال کئے گئے تھے جس کے بیان سے انسانی زبان عاجز ہے۔ لیکن جواب موجبِ غلط فہمی ہورہے ہیں وہی اہمیت دیں جو شروع میں دیتے تھے۔ کیوں نہ وہ الفاظ جو اپنے ابتدائی اور اصلی مقصد کو پورا کرنے کی بجائے غلط بیانی کا باعث بن رہے ہیں چھوڑدیئے جائیں اور ان کی جگہ جدید الفاظ مستعمل ہوں جو اس مخفی حقیقت کوزیادہ وضاحت اور صحت کے ساتھ پیش کرسکیں کیونکہ الفاظ کا کام معانی کوواضح کرنا ہے اور اگر بعض الفاظ خودہی ایسے ہوں کہ ان کی وضاحت کے لئے اور الفاظ کی ضرورت ہو تو ان سے کیا فائدہ؟ کیوں نہ ان کے استعمال سے کنارہ کشی کی جائے۔ اس سوال کا جواب حسب ذیل ہے۔ ہمیں ان الفاظ میں ردوبدل کرنے کا مجاز نہیں جنہیں خدا نے بڑے زور اور تاکید کے ساتھ منظور کیاہے اور ان کا کلام اللہ میں پایاجانا اور عرصہ دراز سے اس کی کلیسیا کا انہیں استعمال کرنا ہمارے لئے ایک حکم کی طرح ہے جس کی اطاعت ہمارا فرض اول ہے۔ علاوہ ازیں اگر دینیات سے یہ الفاظ نکال دیئے جائیں تووہ اپنے ساتھ بہت کچھ اور لے جائیں گے اور کچھ عرصہ کے بعد وہ عجیب حقیقت جس کے متعلق یہ الفاظ متواتر گواہی دیتے آئے ہیں نظروں سے اوجھل ہوجائے گی۔ اورجب خدا کی ابوت یا باپ ہونے کا تصورہی انسان سے چھین لیاجائے تومذہب ایک بے معنی اور بے لطف چیزرہ جاتاہے۔

اگران الفاظ سے محض تشبیہی معنی لئے جائیں یعنی یہ کہ خدا انسان کو اس طور پرپیار کرتا اور ان کی ضروریات رفع کرتاہے جس طرح باپ اپنے بچوں کو پیار کرتا اور ان کی ضروریات مہیا کرتاہے تو انہیں بھی تو ہمارے برادرانِ اسلام ناپسند کرتے ہیں۔ دراصل ان کے اللہ اور ہمارے آسمانی باپ کے تصور میں بڑا فرق ہے۔ اور یہ فرق ایک روایت میں جو احمد ابن حنبل کی مسند 22:6میں مذکور ہے بڑی صراحت سے ظاہر ہوجاتاہے۔ جہاں سیدنا مسیح کی دعاجیسا کہ آنحضرت نے منظور کی نقل کی گئی ہے۔*

یہ بات بڑی پر معنی معلوم ہوتی ہے کہ دعا کے افتتاحی الفاظ "ہمارے باپ" جو ہزاروں کی تسلی کا باعث اور بے شمار لوگوں کو خدا کی طرف متوجہ کرنے کا موجب ہوئے ہیں اس جگہ غیر موجود ہیں۔ اس سے ہمارے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے اگر ہم خدا کے ازل سے باپ ہونے کی تعلیم پر اصرار نہ کریں۔ اور الفاظ "باپ" اور "بیٹا" میں کچھ ردوبدل کرناچاہیں تو اندیشہ ہے کہ ہم خدا کے اوصاف میں سے پدرانہ شفقت کے وصف کو بالکل خارج کردیں۔ اسی طرح اگرہم سیدنا مسیح کے ازل سے ابن ہونے کا انکار کریں تو احتمال ہے کہ شائد کچھ عرصہ کے بعد بیٹے کے درجہ اور اس کی مانند ہونے کی قابلیت اور حق کو بالکل ہاتھ سے کھودیں۔ نہ صرف مسیحی تعلیم بلکہ تاریخ اور عقل سلیم بھی ہمیں اس امر کی تلقین کرتی ہیں۔

مقام افسوس ہے کہ بانیِ اسلام نے قرآن میں ان حقائق کے متعلق جن کی گہرائی سے وہ کبھی پورے طور پر واقف نہیں ہوئے نامناسب الفاظ استعمال کئے جائیں۔ اور یہ بات قرآن شریف سے اظہر امن الشمس ہے کہ انہوں نے خدا کے باپ ہونے کے مسیحی مسئلہ

---

*عبداللہ ایک روایت کو جو عبید النصاری سے منسوب کی جاتی ہے اقتباس کرتا ہے جس میں موخر الذکر یوں بیان کرتاہے کہ نبی ﷺ نے مجھے ایک وظیفہ سکھایا اور اجازت دی کہ جس کسی کے حق میں چاہو استعمال کیا کرو۔ انہوں نے فرمایا کہ یوں کہا کرو" اے ہمارے خداوند جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک (رہے) اللہ جیسا کہ تیرا کلام آسمان پر ہے ویسا ہی زمین اور آسمان پر ہے۔ زمین پر ہمیں رحم عنایت فرما۔ اللہ تو جو نیکوں کا خدا ہے ہمارے گناہوں اور قصوروں کو بخش دے اور (فلاں فلاں پر) اپنے رحم میں سے رحم اور اپنی شفامیں سے شفا اس کی درخواست کے مطابق کہ وہ صحت یاب ہو بھیج دے اور رسول نے یہ بھی فرمایا "کہ اسے قرآن کے دو ظائف کے ساتھ تین دفعہ پڑھا کرو۔

اور ان الہی تعلقات میں جو باپ بیٹا اور روح القدس کے مابین پائے جاتے ہیں اور جو وقت کی قید سے ہر طرح مبرا ہیں اور اہل مکہ کے مشرکانہ توہمات میں بالکل امتیاز نہ کیا جو اللہ کی ذات میں دیویوں کو بھی بطور دختر شامل کیا کرتے تھے۔ اغلباً الفاظ " نہ تووہ جنتا ہے اور نہ کسی سے جنا گیا ہے " اہل مکہ ہی کے خلاف قرآن میں آئے ہیں اور ان کامسیحیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس قسم کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو محمد ﷺ مسیحی مسئلہ تثلیث کو سمجھنے سے بالکل قاصر رہے یا ان جاہلانہ خیالات کی مخالفت کرتے رہے جنہیں ہم بھی فضول اور بے معنی تصور کرتے ہیں۔ *

*قرآن شریف سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد ﷺ کی نظر میں تثلیث کے تین اقانیم باپ بیٹا اور مریم باکرہ تھے۔

اس امر میں رسولوں کے زمانہ اور مابعد کے یہودیوں اور مسلمانوں کے خیالات میں فرق دکھائی دیتا ہے ۔ یہودی گو خدا کی وحدتِ محضہ کے قائل تھے تو بھی جیسا کہ توریت شریف سے ظاہر ہے الفاظ "خداباپ" اور "خدا بیٹا" سننے کے لئے تیار کردیئے گئے تھے کیونکہ یہ الفاظ ان خاص اور نزدیکی تعلقات کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں جو خدا اور کسی قوم کے درمیان ہوسکتے ہیں خواہ وہ ایک جماعت ہو یا کوئی ممسوح بادشاہ یا جیسا کہ آخر میں بتا گیا گیا مسیح موعود ہو۔لہذا مسیح کے حواریوں یاساؤل جیسے عالم اشخاص کے لئے جو واحد خدا کے ماننے والے تھے ان الفاظ سے جو اس رشتہ کو ظاہر کرتے ہیں جو خدا اور اس کے مجسم کلمہ کے درمیان پایا جاتا ہے اعلیٰ اور روحانی معانی اخذ کرنا کوئی مشکل امر نہ تھا۔ علاوہ ازیں فائلو (Philo) جیسے فلسفیوں نے اپنے زمانے کے اہل غور وفکر کو علم مابعد الطبیات کے نکتہ خیال سے اس رشتہ کو سمجھنے کے اہل بنادیا تھا۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر ہم ہم کہیں کہ قرآن شریف نے بھی الفاظ " کلمتہ اللہ " اور "روح اللہ " کے ذریعہ اہل اسلام کو بھی اس عجیب رشتہ کے سمجھنے کے لئے تیار کردیا ہے۔ مسیحی مبلغین کو اس قسم کے اشاروں کو اپنے مطالعہ اور تبلیغ کا مضمون بنانا چاہیئے۔

اب ہم اعتراض اول کا مجموعی طور پر جواب دیں گے ۔ جب ہم جسمانی تخلیق کے خیال کو روحانی شخصیات سے علیحدہ کردیتے ہیں تو الفاظ " باپ" اور "بیٹا" سے محض اخلاقی معنی ذہن نشین ہوتے ہیں جو ہر حالت میں خدا کے شایاں ہیں۔

اور پھر یہ الفاظ وقت اور زمانہ کی مشکل کو دور کردیتے ہیں اور اب "باپ"اور "بیٹا" دونو ہم عصر اور ازلی دکھائی دیتے ہیں۔ اب وحدت میں کثرت کا سوال جو ہمارے پیش نظر ہے تو اس کا جواب ذیل میں دیا جاتا ہے۔

دوسرا اعتراض

تصوراتِ وحدت اور کثرت ایک دوسرے کے متناقص ہیں

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا امتیاز یکسانیت کی ضد نہیں؟ اور کیا تصور کثرت اور تصور وحدت میں تخالف نہیں؟

ہم جواب دیتے ہیں کہ ہر گز نہیں ۔ دنیائے حقیقت میں یکسانیت بغیر تفریق کے محال ہے اور وحدت بغیر کثرت کے ناممکن ۔ توحید فی التثلیث میں کوئی ایسی بات نہیں جو عقل کے خلاف معلوم ہو۔ برخلاف اس کے اگر ہم کسی حقیقی خدا کو ماننا چاہتے ہیں تو ماضی

اور حال کے بہترین فلسفیانہ خیالات اسی قسم کے تصورِ خدا کی طرف ہماری راہنمائی کرتے ہیں۔

فلسفہ جدید بالخصوص بڑی وضاحت سے ظاہر کرتا ہے کہ ہست ہونے کے لئے تعلقات ایک نہائت ضروری عنصر ہیں اور تعلقات بجز امتیازات اور کثرت کے کچھ نہیں۔ جس قدر زیادہ نسبتیں رکھنے والی کوئی چیز ہوتی ہے اسی قدر زیادہ اس کی حقیقت کا اعتبار ہوتا ہے یا یوں کہیں کہ اسی قدر اعلیٰ اس کی وحدت ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے اگر ہم وحدتِ محضہ کا خیال کریں تو ریاضی کی طرح سوائے دماغی تصورات کے اور کچھ ہمارے پاس نہیں رہتا جس کی نہ تو کوئی ظاہری حقیقت ہے اور نہ کوئی خارجی وقعت ہے یا یوں کہیں کہ اس کی قیمت صفر سے ذرا بھی زیادہ نہیں۔ لہذا اس قسم کی ہستی (جیسا کہ ہیگل نے بھی جو کہ زمانہ جدید کے بہترین فلسفہ دانوں میں سے ایک ہے محسوس کیا) درحقیقت ہمارے علم و عقل میں نیستی کے برابر ہے۔

پس کیا ہم خدا کو ایک ایسی ہستی قرار دیں گے جو واحدِ محض ہو۔ جس میں کسی نسبت یا تعلق کا دخل نہ ہو۔ کیا یہ ایک ادنیٰ اور حقیقت سے خالی اور محض وہمی تصور خدا نہ ہوگا؟ کیا ہمارے پاس اور کوئی بہتر اور اس شان کے زیادہ لائق تصور نہیں ہے؟ کیوں نہ ہم کوئی بہترین اور اعلیٰ ترین تصور ذات الٰہی کا قائم کریں۔ الٰہی تصور میں تعلق کا ہونا ایک امر لازمی ہے۔ لیکن یہ ذاتی تعلق کسی فانی یا حادث شے سے نہ ہوگا۔ بلکہ اس کی ذات خاص ہی سے متعلق ہوگا۔ کیونکہ اگر ایسا کریں تو ہم اس متعلقہ چیز کو خدائے ثانی کا درجہ دے دیتے ہیں۔ چنانچہ لازماً یہ تعلق یا رشتہ زندہ خدا کی وحدت کے دائرے ہی میں ہونا چاہیئے۔ اگر ہم خدا کو ایک زندہ حقیقت مانتے ہیں تو ضرور ہے کہ اسے چند گونا گوں تعلقات اور مختلف نسبتوں کا مرکز اور مورد تسلیم کریں۔ کیونکہ یہ کافی نہیں کہ وہ محض بعض دماغی یا وہمی مطالبات کو اپنی ذات میں پورا کرے جیسے کہ علتِ اول کا مطالبہ ہے۔ جہاں تک اسلامی علم الٰہی اور فلسفہ نے پرواز کیا ہے۔

لیکن ہم اس منزل سے بہت زیادہ آگے بڑھ جاتے ہیں اور مشاہدہ کی بنا پر بتاتے ہیں کہ جس قدر زیادہ کسی چیز یا ہستی میں متنفرقات ہوتے ہیں اسی قدر زیادہ اس کی وحدت اعلیٰ اور ذی قدر ہوتی ہے۔ لہذا اگر ہم اس امر کو پائیہ ثبوت تک پہنچادیں تو ہمارے اس دعوےٰ کو کہ خدا میں جو تمام ہستیوں سے اعلیٰ اور بڑھ کر ہے بہترین وحدت کی وجہ سے بہترین کثرت بھی پائی جاتی ہے بہت تقویت پہنچ جائے گی۔

جب ہم فطرت کا جس میں بعض اوقات اس صانع مطلق کی جھلک دکھائی دیتی ہے مطالعہ کرتے ہیں تو ظاہر ہوجاتا ہے کہ جن اشیاء میں بہت کم متفرق عناصر پائے جاتے ہیں ان میں وحدت بھی بہت ادنیٰ درجہ کی نظر آتی ہے۔

مثال کے طور پر پتھر کو لے لیجئے۔ یہ صحیح ہے کہ اس میں وحدت ہے۔ وہ ایک پتھر ہے لیکن وہ وحدت کس قدر بے وقعت ہے۔ اب اس پتھر کو دو حصوں میں تقسیم کردیجے۔ لیکن ایسا کرنے سے نہ تو آپ پتھر کی ہستی کو تلف کردیتے ہیں اور نہ ہی اس کی وحدت کو کھو دیتے ہیں (ہم ریاضی کے نکتہ خیال سے یہ نہیں کہتے) کیونکہ اب آپ کے پاس دو پتھر ہیں یا یوں کہیں کہ دو اکائیاں ہیں جن میں سے ہر ایک اسی قدر واحد کہلانے کی مستحق ہے جس قدر تقسیم سے پہلے تھی۔ یہ تو اس چیز کی مثال ہے جو متفرقات سے عنقریب خالی ہے۔

لیکن اب ہم جاندار اشیاء کے عالم کا ذکر کرتے ہیں۔ اس عالم کا حال مختلف ہے۔ گو یہاں بھی ہم کو مدراج دکھائی دیں گے یعنی وحدت کی قدر و منزلت مختلف امتیازات کی زیادتی پر منحصر نظر آئے گی۔

اگر ہم ادنیٰ ترین درجہ یعنی عالم نباتات سے شروع کریں تو ہم دیکھیں گے کہ جہاں کثرت اور اختلاف کا امتیاز تھوڑا ہے وہاں وحدت اور یکتائی بھی مثل پتھر کے بہت کم پایہ ہے۔ مثال کے طور پر کائی کو دیکھئے۔ آپ اسے کتنے ہی حصوں میں تقسیم کردیں لیکن اس کے اصل اوصاف میں سرموفرق نہ آئے گا۔ کائی کا ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے سے اوصاف ضروری کے لحاظ سے ذرا بھی مختلف نہ ہوگا۔ اس میں کوئی خصوصیت دکھائی نہ دے گی لیکن آپ عالم نباتات کے اعلیٰ طبقوں کی سیر کریں تو معلوم ہوگا جس قدر کسی چیز کے اندرونی اختلافات میں زیادتی ہوتی جائے گی اسی قدر وہ چیز زیادہ ایک ہوتی جائے گی۔ یعنی (1) آپ ان کی زندگی اور ہستی کو معرضِ خطر میں ڈالے بغیر اسے تقسیم نہ کرسکیں گے۔ (2) ایک چیز دوسری چیز سے بالکل مختلف دکھائی دے گی یا یوں کہیں کہ ہر ایک چیز اپنے اوصاف اور اطوار کے لحاظ سے دوسری سے نرالی معلوم ہوگی۔ حقیقی وحدت کی یہی دو خاص نشانیاں ہیں۔ یعنی قابل تقسیم ہونا اور خصوصیت رکھنا۔ اور انہی دونوں سے فرد بنتا ہے۔

یہی نقشہ طبقاتِ زندگی میں دکھائی دے گا جہاں علم اور ادراک کو دخل ہے یعنی عالم حیوانات میں۔

ابتدائی منازل میں افتراق کم ہوگا۔ لہذا وحدت بھی کم رتبہ ہوگی۔ بعض جانور ایسے ہیں کہ ان کو مختلف حصص میں تقسیم کردیں تو بھی کچھ عرصہ کے لئے وہ منقطع حصے زندہ اور متحرک رہیں گے۔ ان کی وحدت کمزور ہے کیونکہ ان میں افتراق کی کمی ہے۔ چنانچہ پھر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جس قدر کسی جانور میں اندرونی اختلافات کم ہوں گے اسی قدر اس کی انفرادی خصوصیت کم ہوگی۔ اسی تناسب سے اس میں نرالا پن کم ہوگا اور اسی قدر اس کی تقسیم یا بربادی بے معنی اور بے اثر ثابت ہوگی۔

لیکن زندگی کے اعلیٰ مدارج میں جہاں ادراک اور فہم کی عملداری زیادہ ہے وہاں ایک طرف تو اندرونی اختلافات بڑی ترقی پر نظر آئیں گے اور دوسری جانب اندرونی اشتراک اور وحدت بھی پورے طور پر مسلط دکھائی دے گی۔ اور اس وحدت کے خاص نشان ناقابل تقسیم ہونا اور خصوصیت رکھناہوں گے۔ جانوروں سے انس رکھنے والے بتاتے ہیں کہ ایک جانور اپنے ساتھ کے ہم جنس جانور سے اس قدر مختلف ہوتا ہے جس قدر ایک شخص دوسرے شخص سے۔ ان میں سے ہر ایک فرد بے مثل ہوتا ہے۔ یا بہ الفاظ دیگر یوں کہیں کہ ہر ایک جانور میں اعلیٰ درجہ کا اشتراک وافتراق ہے اور یہ حقیقت انسان کے وجود میں اور بھی زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔ جہاں وحدت اور کثرت اپنے انتہائی درجوں میں پائی جاتی ہیں۔

اس حقیقت کو ایک جملے میں یوں بیان کرسکتے ہیں۔ دنیائے زیست وفہم میں جس قدر کسی چیز میں اندرونی امتیازات زیادہ ہوں گے اسی قدر وہ زیادہ واحد ہوتی جائے گی۔ شلغم کی نسبت انسان میں اوصاف وحدت بہت زیادہ پائے جاتے ہیں کیونکہ اس میں متفرقات بھی ہیں۔

اگر ہم اس امر کو اصول قرار دے سکیں تو میں بصد عجزوانکسار کہوں گا کہ اس سے ہمارے مبحث پر بڑی روشنی پڑتی ہے۔ اب ہم اس کا اطلاق اس ہستی پر کریں گے جس میں زندگی اور ادراک اپنے کمال کو پہنچتے ہیں۔ جو بالکل بے مثل اور مطلقاً ناقابل تقسیم ہے اور جس میں وحدتِ کامل کہ شرائط بوجہ احسن پوری ہوتی ہیں اور جو اکیلاواحد خدا ہے۔ چنانچہ نہ صرف یہ امر قرین قیاس ہی ہے بلکہ ہم خواہشمند ہوں گے کہ ہم پر منکشف کیا جائے کہ اس کی ذات پاک میں اندرونی اختلافات اسی ناقابل فہم اور انتہائی درجہ تک ترقی کئے ہوئے ہیں جس درجہ تک اس کی وحدت ہر مخلوق پر فوقیت رکھتی ہے۔ گو ان اختلافات

کی ماہیت سے واقف ہونا ہمارے لئے ناممکن ہے ۔ لیکن تو بھی ان کی حقیقت اور موجودگی کا یقین کرنا کوئی مشکل بات نہیں ہے اور یہی وہ کیفیت ہے جو تثلیث میں انکشاف پذیر ہوتی ہے ۔ یہ ایک اعلیٰ ترین حقیقت ہے جس کی ادنےٰ نظیریں دنیا میں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ اپنی بلند پائیگی میں بے مثال ہے اور یہی اختلاف جو تشخصات کے علم وادراک میں پایا جاتا ہے اسے اس قدر بلند پایہ بنادیتا ہے ۔

لہذا ہم اس تمام بحث کا ماحصل یوں رقم کرینگے کہ الہیٰ وحدت جو سب سے اعلیٰ اور پر معنی ہے وہ تین تشخصات کے اندرونی مگر حقیقی امتیازات سے وابستہ ہے ۔ اور وہ خدائے واحد ہے جس کا نام ابد الآباد مبارک ہو۔آمین

(1)اہلِ اسلام اس پر اعتراض کریں گے کہ خالق اور مخلوق کا باہمی مقابلہ نہ صرف بعید از عقل ہے بلکہ خلافِ شان خدا بھی ہے ۔ کیونکہ ذاتِ الہیٰ کا سب سے بڑا وصف یہی ہے کہ وہ بے مثل وبے عدیل ہے اور اس میں اور مخلوق میں کوئی مشابہت نہیں ہے ۔ لیکن میں نے اسلامی تصور خدا کا ذکر کرتے ہوئے اس اعتراض پر کافی بحث کی ہے ۔ اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ غیر مماثلت کی تعلیم بالکل بے معنی اور غیر تسلی بخش ہے جو اللہ کو صغر کے درجہ تک گرادیتی ہے اور ہمیں اس کے متعلق کسی قسم کا خیال کرنے اور تصور باندھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ ہمارے برادران اسلام کا عمل ان کی اس تعلیم سے بہتر ہے۔ کیونکہ وہ یہی کہنے پر کہ " اللہ یہ نہیں اور وہ نہیں " اکتفا نہیں کرتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ وہ زندہ ہے صاحب علم وارادہ ہے ۔ وغیرہ اور ان کا یہ کہنا مشابہت اور مماثلت پر زبردست دلالت کرتا ہے۔ بلکہ یہ خیال بالکل عبث اور لاحاصل ہے کہ ہمارے علم اور الہیٰ علم میں تفاوتِ عظیم ہے اور کہ اس کا علم اس قدر بعید القیاس ہے کہ ہمارے علم سے اس کا مقابلہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اگر ہمارے علم اور اس کے علم میں کوئی مشابہت نہیں تو دونوں علموں کو ایک ہی نام سے نامزد کیوں کیا گیا ہے۔ کیا بہتر نہ ہوگا کہ اہل اسلام اس غیر مماثل تعلیم کی نظر ثانی کریں اور اس امر کا اعتراف کریں کہ گو خدا ہم پر ہر ایک بات میں فضیلت اور فوقیت رکھتا ہے ۔ لیکن تو بھی بعض اوصاف ایسے بھی ہیں کہ جن میں اسے نے اپنی کمال مہربانی سے " انسان کو اپنی شکل پر بنایا " ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ اللہ کی ذات پاک سے ایسے اوصاف منسوب نہ کرنا جو اس کی شان کے لائق نہ ہوں مناسب اور قابل تعریف ہے۔ لیکن مسیحیت نے بھی اس امر میں حد واجبی سے کبھی تجاوز نہیں کیا۔ مثلاً مضمون زیر بحث میں ہم محض ایک عقلی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وحدت محضہ اول تو تصور ہی میں نہیں آسکتی اور پھر اگر آبھی جائے تو بالکل بے وقعت ثابت ہوتی ہے اور کہ اعلیٰ درجہ کی وحدت میں کثیرت کا ہونا ضروری ہے ۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اس میں کونسی مادی اور خلاف تعظیم بات ہے۔

(2)اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ مذہبِ اسلام خود مختلف اوصاف یعنی رحم اور انصاف وغیرہ خدا کی ذات واحد سے منسوب کرتا ہے ۔ لیکن اسلام نے کبھی ان اوصاف کو شخصیت کا جامہ نہیں پہنایا جیسا کہ مسیحی کرتے ہیں۔

اس کے متعلق ہم دو جواب پیش کرتے ہیں (الف)اوصاف کی کثرت ہرگز اس عقلی مطالبہ کو جس کا اوپر ذکر کیا جاچکا ہے پورا نہیں کرتی۔ اور بجائے امتیازات کی اعلیٰ ترین صورت کے ایک نہائت ہی ادنیٰ اور نحیف سی صورت پیش کرتی ہے۔

کیونکہ اوصاف بجائے خود کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ جوہر سے علیحدہ ان کا وجود بھی باقی نہیں رہتا۔ اور رحم انصاف وغیرہ فعل الہیٰ کے مختلف پہلو ہیں جن میں حسب مرضی کمی

بیشی کی جاسکتی ہے۔ اور یہ امر اس قسم کی کثرت کے عارضی اور غیر حقیقی ہونے پر بڑی واضح دلالت کرتا ہے۔ جس کثرت کی ہمیں ضرورت ہے وہ ایسی کثرت امتیازات ہونی چاہئیے جو وحدت کی طرح لاتبدیل ہو(ب) مسیحیت محض اوصاف کو شخصیت کا جامہ نہیں پہناتی جیسا کہ اہل اسلام نے غلطی سے سمجھ لیا ہے۔ یہ غلط فہمی کہ باپ مجسم انصاف ہے اور بیٹا مجسم رحم ہے وغیرہ بہت دیرینہ مگر سراسر بے بنیاد ہے ۔ بائبل مقدس اور ہمارے علم الہٰی میں اس کی کھیں تائید نہیں ہے ۔ بلکہ باپ اور بیٹا دونوں عادل اور رحیم قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

(3) یہ بھی اعتراض پورا ہوسکتا ہے کہ کثرت میں وحدت اور افتراق میں اتحاد کے اصول کا اطلاق محض مادی اشیاء پر ہوسکتا ہے۔ روحانی ہستیوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن ہم بر خلاف اس کے اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ جوں جوں ہم نے ادنیٰ طبقات سے اعلیٰ طبقات کی طرف ترقی کرتے جاتے ہیں اور بے جان اشیاء کے بعد جاندار اور ان میں سے احساس رکھنے والی اشیاء اور آخر اذی عقل ہستیوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کی روحانیت عین ان کے اندرونی تفاوت کے ہمرکاب نظر آتی ہے۔ لہذا ایک قدم اور آگے بڑھ جانے اور یہ کہنے میں کونسی عقلی یا منطقی مشکل حائل ہوجاتی ہے کہ اس الہٰی اور اعلیٰ ترین ہستی پر بھی جہاں مادیت کا کوئی دخل نہیں اور جو سراسر روحانیت سے ملبوس ہے اس اصولِ کثرت اور وحدت کا ویسا ہی اطلاق ہوتا ہے جیسے ادنیٰ درجہ کی اشیاء پر ۔ اگر فرق ہے توصرف اتنا کہ اس کی وحدت اور کثرت ان سے کھیں بالاتر ہیں؟ اگر یہ معلوم کرنا کہ اس الہٰی شخصیت اور ادنیٰ درجہ کی ہستیوں اور اشیاء میں کتنا بڑا فرق ہے ہمارے فہم وتصور سے بعید ہے تو ان افترقات کا علم بھی جو اس وحدت میں پائے جاتے ہیں ہمارے وہم وخیال سے کھیں بالا ہے ۔ لہذا ہمیں پھر کھنا پڑتا ہے کہ ہمارے اس معیار کے مطابق تشحصات کے لاتبدیل اور حقیقی گونا گوں اختلافات پورے اتر سکتے ہیں اوصاف کے خیالی امتیازات سے ہمیں تسلی نہیں ہوسکتی۔

(4)آخراً یہ بھی اعتراض ہوسکتا ہے کہ جب ہم عالم مادی سے گذر کر عالم روحانی میں آجاتے ہیں تو یہ نظام زندگی جو مادی اشیاء میں نظر آتا ہے ختم ہوجاتا ہے۔

لیکن ہم جواب میں پوچھتے ہیں کہ جب ہم ہستی اور زندگی کا اطلاق ذات الہٰی پر سکتے تو اس حقیقت کے اطلاق سے جس کا بیان کافی طور پر ہوچکا ہے کیوں گریز کریں؟ ہستی کا اطلاق محض ادنیٰ ترین اشیاء پر ہوسکتا ہے لیکن زندگی کا اطلاق اعلیٰ اور ادنیٰ دونو پر ہوسکتا ہے۔ لیکن ہستی اور زندگی ہر دو کااطلاق ذات الہٰی پر ہوتا ہے تو کیوں نہ یہ حقیقت اتحاد ورافتراق خدا سے منسوب کی جائے کیونکہ ہم ثابت کرچکے ہیں کہ یہ حقیقت زیادہ سے زیادہ اعتراض سے تیسرا بڑا اعتراض خلاف مسیحیت پیدا ہوتاہے جس کا جواب حسب ذیل ہے۔

تیسرا اعتراض

مسئلہ تثلیث ذاتِ الہٰی کو مرکب اور قابل تقسیم بنادیتا ہے

کیا کسی زندہ نظام میں جس میں ترکیب پائی جاتی ہے تقسیم کو گنجائش ہے ؟ کیا مسئلہ تثلیث انفراقِ ذات الٰہی پر دلالت نہیں کرتا ؟ امید ہے کہ ذیل کی دلائل سے اس اعتراض کا خاطر خواہ جواب مل جائے گا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ قابل تقسیم وہی چیز کہلاسکتی ہے کہ جس کی ہستی وقت تقسیم منقطع نہ ہوجائے۔ مثلاً پتھر کو اگر دو حصوں میں منقسم کر دیا جائے تو بھی اس کے پتھر ہونے میں ذرا بھی فرق نہ آئے گا۔ اسی طرح اگر ایک مشین کے مختلف حصص یا پرزے علیحدہ علیحدہ کردئیے جائیں تو بھی مشین کی ہستی برباد نہیں ہوجاتی کیونکہ وہ پرزے پھر اسی طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ مختلف صورتوں میں مختلف اشیاء پتھر ،دھاتیں اور مشین وغیرہ قابلِ منقسم ہیں۔ لیکن جب ہم ان اشیاء کا ملاحظہ کرتے ہیں جن میں زندگی ہے (دیکھو آخری باب) تو حالت دگرگوں نظر آتی ہے۔ آپ اس مادے کو تو تقسیم کرسکتے ہیں جس سے وہ اشیاء بنی ہیں لیکن خود ان چیزوں کو تقسیم نہیں کرسکتے۔

اس کا کیا مطلب ہے ؟ مطلب صاف ہوجاتا ہے کہ جب آپ ایک پھول کو لے کر اس کی پنکھڑیاں علیحدہ کردیتے ہیں تو کیا آپ پھر اس پھول کو بحال کرسکتے ہیں؟ ہر گز نہیں۔ کیونکہ آپ نے اسے تقسیم نہیں کیا۔ آپ نے اسے برباد کردیا۔ وہ مردہ ٹکڑے جو آپ کے سامنے پڑے ہیں نہ پھول ہیں اور نہ ہی ان سے پھول بن سکتا ہے۔ پھول اور اس کی ہستی جاتی رہی۔ آپ پھول کو تقسیم نہیں کرسکتے یا تو اسے رکھیں یا برباد کردیں۔

ہاتھ جب جسم سے جدا ہوجاتا ہے تو ہاتھ کہلانے کا مستحق نہیں رہتا۔ وہ محض گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جو ہاتھ کے مشابہ ہے۔ کیونکہ جسم کے ساتھ وابستہ رہنا اور اپنی نسوں کے ذریعہ دماغ سے تعلق رکھنا اور اس کل کی زندگی میں سے ایک عضو بن کر زندگی حاصل کرنا ہاتھ کا خاص وصف ہے۔ اگر آپ کہیں کہ ہاتھ جسم کا حصہ ہے اور ایسا کہنے سے آپ کا مطلب ہو کہ جسم سے علیحدہ ہوجانے پر بھی ہاتھ ہاتھ ہی کی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے تو یہ محض ایک دماغی خیال ہوگا اور اس میں چنداں صحت نہ ہوگی۔ اور ایسا کرنے سے آپ بعض اوصاف کو جو ہاتھ میں ہونے چاہئیں اپنی مرضی کے مطابق منتخب کرلیتے ہیں اور دیگر اوصاف کو جو اسی قدر یا ان سے زیادہ اہم ہیں نظر انداز کردیتے ہیں۔

لہذا ہم بغرضِ اعادہ پھر کہتے ہیں کہ آپ کسی زندہ نظام کے مادہ کو تو تقسیم کرسکتے ہیں لیکن آپ اس زندہ چیز یا اس کے افتراق کے اتحاد کو تقسیم نہیں کرسکتے۔ آپ اس کے رشتہ زندگی کو پیش از وقت منقطع تو کرسکتے ہیں لیکن اسے مختلف حصوں میں علیحدہ نہیں کرسکتے۔ اور آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ غیر مادی چیز ہر حالت میں ناقابل تقسیم ہے۔

چنانچہ خدا جس میں مادہ کا نام ونشان نہیں تصور اور حقیقت ہر دو کے اعتبار سے تقسیم سے مبرا ہے۔

لہذا ثابت ہوا کہ زندگی رکھنے والی دنیاوی چیزیں یا تو اپنے مکمل اوصاف کے ساتھ رہیں گی یا برباد ہوجائیں گی۔ ان میں تقسیم کا مطلقاً امکان نہیں۔ چونکہ خدا برباد نہیں کیا جاسکتا لہذا وہ صرف اپنی کامل ماہیت کے ساتھ ہی جو غیر منقسم اور ناقابل تقسیم ہے زندہ رہتا ہے۔ یعنی اپنی وحدت میں جو باپ بیٹا اور روح القدس پر مشتمل ہے۔

لہذا جس طرح ہم نے سیکھا کہ عضو،حصہ یا پرزے سے مختلف ہے کیونکہ وہ اسی وقت زندہ رہ سکتا ہے۔ جب تک کہ اپنے کل کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسی طرح باپ بیٹا اور روح القدس بھی ہر گز ہر گز حصے نہیں بلکہ ازل سے حقیقی معانی میں ایک دوسرے کی وحدت سے وابستہ ہیں اور ایک ناقابل تقسیم اور دائمی وحدت کے اقانیم ہیں۔ لیکن ایسا کہنے سے ہم ان کے انفرادی اور امتیازی اوصاف کی تردید نہیں کرتے۔ بلکہ برعکس اس کے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں اور ان کے اوصاف خصوصی کو بجائے وحدتِ خدا کا رد

سمجھنے کے اس کی کامل وحدت کا بہترین ثبوت تسلیم کرتے ہیں ۔ اس کا جلال ابدالآباد ہوتا رہے ۔

چنانچہ اس تمام بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خدا کی ذات ناقابلِ تقسیم ہے اور اس میں حصص نہیں۔ لیکن اس میں تین اقانیم ہیں۔

چوتھا اعتراض

تثلیث کو ماننا لازماً تین خداؤں پر اعتقاد رکھنا ہے

چوتھا اعتراض تثلیث کے خلاف یہ ہے کہ اگر معتقدانِ تثلیث محتاط نہ ہوں تو وہ ایک غلطی کے مرتکب ہوجائیں گے ، جس کی روسے خدا ایک جنس (یاصنف۔ان دونو الفاظ کے معانی میں بہت فرق نہیں. لهذا یہ فیصلہ کرناکہ ہمارے مطلب کو کونسا لفظ بہتر طور پر ادا کرے گا مشکل ہے) ہوجاتاہے جس میں تین افراد پائے جاتے ہیں اور ایسا کرنا توحید کو چھوڑ کر تین خداؤں کو ماننا ہے (نعوذ باالله)۔

لیکن اگر غائر نظر سے ملاحظہ کیا جائے تو اس اعتراض کا بوداپن بہت جلد ظاہر ہوجائے گا۔

اعتراض یہ ہے کہ جنس یا صنف ایک کل ہے جس کے بہت سے اجزاء ہوتے ہیں۔ انسان ایک صنف ہے اور عمرو ،زید اور عبید وغیرہ افراد ہیں جو اس میں شامل ہیں۔ لہذا اگر خدا کو ایک جنس تصور کرلیا جائے تو جس طرح جنس انسان کے تین افراد عمرو ، زید اور عبید تین مرد ہیں اسی طرح جنس خدا کے تین اقانیم تین مختلف خدا ہوں گے ۔ اگر سچ مچ یہ استدلال صحیح ہو تو ہم تثلیث کے ماننے والے نہ کہلائیں ۔ لیکن یہ درست نہیں ہے ذیل کی دو دلائل سے اس اعتراض کی تردید ہوجاتی ہے ۔

(1)جنس جس کی تعریف ہم اوپر کرچکے ہیں بذاتِ خود کوئی خارجی حقیقت یا ہستی نہیں رکھتی ۔ وہ ایک ذہنی کیفیت ہے جو مشترک اوصاف رکھنے والے بہت سے افراد کے مشاہدے سے دماغ میں جاگزیں ہوجاتی ہے لیکن خدا ایسی ذہنی کیفیت نہیں ہے ۔وہ ایک مسلمہ حقیقت ہے ۔ وہ ایک زندہ ہستی ہے لہذا پاک تثلیث کے بعیدا لفہیم تشخیصات خواہ اور کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن وہ افراد تو ہر گز نہیں جو ایک جنس خدا میں شامل ہیں۔ لہذا یہ الزام کہ ہم تین خداؤں کو ماننے والے ہیں رد ہوجاتا ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ مختلف فلسفیوں نے ان کلیات کے متعلق بہت بحث کی ہے کہ آیا ظاہر کرتے ہیں یا محض ذہنی اختراع ہیں یا الفاظ ہیں جو افراد کے مشترکہ اوصاف کو ظاہر کرتے ہیں یا محض نام ہیں جو تقسیم کی سہولت کی غرض سے گھڑلئے گئے ہیں۔ نامی نے لسٹس (Nominalists) کی یہی تعلیم تھی۔ دوسرے گروہ نے ان کلیات کے وجود کا اعتراف کیا اور اسے نامی نے لسٹس (Nominalists) کی نسبت حقیقت پر زیادہ مبنی سمجھا اور کہا کہ کلیات محض نام ہی نہیں بلکہ دماغ کا حقیقی تصور ہیں۔ اس خیال کے بانی کانسیپچوئے لسٹس (Conceptualists) کہلائے۔ لیکن ارسطو کلیات کے حقیقی ہونے پر بڑا زور دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ گو ہر ایک کل ان اجزا سے جو اس میں شامل ہیں مختلف ہے لیکن تو بھی ان سے نزدیکی مشابہت رکھتا ہے۔

خیالِ محدود کے نزدیک وہ مشابہت کوئی وجود نہیں رکھتی۔ لیکن خیال لامحدود کے لئے وہ صورتیں جو کسی صنف کے تمام اجزاء میں نظر آتی ہیں تمام حقیقتوں سے زیادہ قابل یقین حقیقت ہیں کیونکہ وہ خدا کے غور وفکر کا مضمون ہیں۔ لہذا ارسطو اور اس کے ہم

خیال معتقدان حقیقت (Realists) کہلائے۔ لیکن انہوں نے بھی ان کلیات کی جداگانہ ہستی یا حقیقت سے انکار کیا۔ صرف افلاطون نے ان کے متفرق وجودوں کا اعتراف کیا اورکہا کہ مختلف اجناس یعنی انسان حیوان وغیرہ ایک دنیائے متصورہ اور عالم آسمانی کے باشندے ہیں اور وہ دنیاوی اشیاء کی طرح حقیقی اور وجود رکھنے والے ہیں بلکہ وہ اس سے بھی بڑھ جاتا ہے اور انہیں حقیقت واحد بتلاتا ہے ۔ اور کہتا ہے کہ ان کے مقابلہ میں زمینی انسان ،گھوڑے وغیرہ مثل سایہ کے ہیں۔ اور اگر ان میں کوئی حقیقت ہے تو اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے متصورہ اور آسمانی انسان ،گھوڑوں وغیرہ کی نقل ہیں اور ان کے مشابہ ہیں۔ اور ان آسمانی اجناس کووہ تصورات کے نام سے نامزد کرتا ہے۔ لہذا اس کے پیرو اہلِ تصور (Idealists) کہلائے۔

یہ فلسفیانہ خیالات زمانہ موجودہ کے فلسفہ سے چنداں تعلق نہیں رکھتے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ باریک اختلافات جن کا ذکر ہوا بہت ضروری اور مفید نہیں ہیں تاہم ان مباحثات کے تصفیہ میں بہت کشت وخون ہوا ہے۔

لیکن خوفِ طوالت سے ہم ان کے وجوہ کی تشریح نہیں کرسکتے ۔ ہمارے مبحث کے متعلق محض اتنی بات ہے جو بیان ماقبل سے مترشح ہوتی ہے کہ خدا جو اعلیٰ ترین زندہ حقیقت ہے کسی معنی میں بھی ایسا کلی نہیں کہ جس کے بہت سے جذبات ہوں جیسا کہ مذکورہ بالافلسفیوں نے بیان کیا ہے۔

پس جب کہ خدا نہ تو محض ایک نام ہے اور نہ ہی صرف دماغی تصور ہے اور نہ ہی جوہر ہے (اور نہ ہی افلاطون کی تعلیم کے مطابق ہستی متصورہ ہے . لیکن اس کےامکان پر عور کرنا ہمارے لئے ضروری نہیں کیونکہ تمام متاخرین نے اس خیال کی تردید کی ہے اور افلاطون خود بھی اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتا. وہ اسے ان دماغی مساعی میں سے جو اس نے میدان حقیقت میں کی ہیں ایک معمولی سی کوشش سمجھتا ہے) جیسا کہ بعض عالمان مابعد الطبیات مانتے ہیں۔ بلکہ ایک کامل بہترین اور زندہ حقیقت ہے تو ہم کیونکر اسے ایک کلی کی صورت میں قبول کرسکتے ہیں اور کس طرح تشخصات تثلیث مبارک کو اس کلی کی جزیات (یعنی مختلف خدا)مان سکتے ہیں ۔ لہذا تین خداؤں کے ماننے کا الزام بے بنیاد ثابت ہوجاتا ہے ۔

(2)دوسری دلیل جو اس اعتراض کی تردید کرتی ہے حسب ذیل ہے جنس (مثلاًانسان) خواہ اس میں حقیقت زیادہ ہو یا کم اپنے ایک یا ایک سے زیادہ اجزا کی تلفی سے ہر گز منہدم نہیں ہوسکتی ۔ اگر آپ جنس انسان میں سے عمرو ،زید ،عبید وغیرہ یا جتنے چاہیں افراد نکال دیں تو بھی اس جنس میں ذرا بھی فرق پیدا نہ ہوگا۔

جس سے ثابت ہوا کہ جنس ایک زندہ واحد شے نہیں ہے کہ اس کے اجزا کی ہستی کے مٹ جانے کا اثر اس پر پڑسکے۔ لیکن ہر کمال عاجزی اور تعظیم کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ذاتِ خدا میں جو کامل اور زندہ ہے صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے ۔ اس کی وحدت تین اقانیم پر منحصر ہے جن میں سے کوئی بھی جداگانہ زندہ نہیں رہ سکتا بلکہ ہر ایک دوسرے میں اور دوسرے کے ساتھ زندہ رہتا ہے ۔ لہذا باپ ذاتِ خدا کا ایک اقنوم ہے ۔ یہ تینوں اقانیم جدا جدا تین خدا نہیں ہیں بلکہ واحد خدا ہے ۔ اسی کے نام کی تمجید ابد الاآباد ہوتی رہے ۔آمین ۔

پانچواں اعتراض

لہذا مسئلہ تثلیث بے معنی اور بلا مقصد ہے

آخری اعتراض یہ ہے کہ چونکہ مذکورہ بالا بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ باپ بیٹا اور روح القدس تینوں خدا کے جوہر میں سے جوہر ہیں لہذا ان میں سے ہر ایک خالص اور امتیازی اوصاف منسوب کرنا ناممکن ہے ۔ اس لئے ان میں فرق کرنا محال اور بے معنی ہے۔ یا بالفاظِ دیگر یہ کہنا کہ ان میں سے ایک اقنوم ایک خاص کام کرتا ہے جو دوسرا نہیں کرتا محال ہے ۔ لہذا اس کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ تمام مسیحی تعلیمات متضاد باتوں سے پر ہیں۔

یہ اعتراض ایک چھوٹی سی کتاب میں جو کہ ایک نوجوان مسلمان ڈاکٹر کے قلم سے نکلی ہے بڑے زور کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے ۔ اور وہ یوں ہے ۔

علاوہ بریں نصارئے کا یہ دعویٰ کہ اللہ جوہر کے لحاظ سے ایک ہے ۔ اور اس میں تین تشخصات ہیں بالکل بلادلیل اور بے معنی ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اقنوم اوصاف کے لحاظ سے دوسرے سے مختلف ہے ۔ اقنوم اول باپ ہونے کے لحاظ سے اقنوم ثانی بیٹا ہونے اور تجسم کے لحاظ سے اقنوم ثالث اپنے صدور اور ظہور سے لحاظ سے اور وہ ان امتیازات کو حقیقی مانتے ہیں یہاں تک کہ جو وصف ایک سے منسوب کرتے ہیں وہ دوسرے سے متعلق نہیں کرتے ۔ اس کا جواب میں یہ دیتا ہوں کہ ایک امتیازی وصف جو ایک اقنوم میں پایا جاتا ہے اور جو اس میں اور دوسروں میں امتیاز پیدا کردیتا ہے وہ اسی کے ساتھ وابستہ ہے یا یوں کہیں کہ اس کے جوہر میں داخل ہے ۔ لہذا وہ اللہ کے جوہر کا حصہ ہے۔ کیونکہ اللہ کا جوہر ایک اور ناقابل تقسیم ہے جسے ہر ایک مسیحی تسلیم کرتا ہے اور ان کی تعلیم کے مطابق ہر ایک اقنوم کا جوہر اللہ کا جوہر ہے لیکن وہ بھی مانتے ہیں کہ وہی وصف چونکہ امتیازی وصف جو ایک اقنوم میں پایا جاتا ہے اور جو اس میں دوسروں میں امتیاز پیدا کردیتا ہے وہ اسی کے ساتھ وابستہ ہے یا یوں کہیں کہ اس کے جوہر میں داخل ہے ۔ لہذا وہ اللہ کے جوہر کا حصہ ہے ۔ کیونکہ اللہ کا جوہر ایک اور ناقابل تقسیم ہے جسے ہر ایک مسیحی تسلیم کرتا ہے اور ان کی تعلیم کے مطابق ہر ایک اقنوم کا جوہر اللہ کا جوہر ہے لیکن وہ بھی مانتے ہیں کہ وہی وصف چونکہ امتیازی وصف ہے وہ دوسرے کسی اقنوم کے اوصاف میں شمار نہیں کیا جاسکتا لہذا اس کے جوہر میں داخل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اللہ کے جوہر میں داخل نہیں کیا جاسکتا ۔ لہذا ایک ہی وصف اللہ کے جوہر میں داخل بھی ہے اور خارجی بھی ہے جو کہ لغو اور بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے ۔ اس استدلال کے مطابق آپ یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ چونکہ تجسم بیٹے کی صفت ہے اس لئے اللہ مجسم بھی ہوا اور نہیں بھی ہوا۔ یہ باہمی تضاد اس دعوےٰ کی بطالت کو خود ظاہر کردیتا ہے ۔

اس اعتراض کا جواب یوں دیا جاسکتا ہے کہ طبعیات اور مابعد الطبعیات میں جب ہم انتہائی منازل میں آجاتے ہیں تو تناقضاتِ منطقی کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ وقت اور ازلیت اور خلق کرنا اور خلقت سے بے نیاز ہونا اور لامحدودیت ، ان تمام میں تناقض پایا جاتا ہے اور اس تناقض کا دورہ کرنا عقلِ انسانی کے لئے مشکل ہے۔ اور فلسفیوں نے ایک اصطلاحی نام ان کے لئے تجویز کیا ہے ۔ یعنی تناقضات عقلی ۔ لہذا اگر ہمارے عقیدہ تثلیث نے التوحید میں کوئی ایسا تناقض رہ جائے تو کوئی حیرانی یا تشویش کی بات نہیں۔

اس ضمن میں ہم یہ ظاہر کردینا چاہتے ہیں کہ مصنف موصوف جو بڑے منطقی ہونے کے دعویدار ہیں خود بھی ان تناقضات سے بچنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ بیان مافوق میں وہ

ایک اور سوال کی انتہا اور غایت پر بحث کرتے ہیں یعنی مادہ کی انتہائی ساخت اور ماہیت پر اور ذرہ پر پہنچ کر سوال اٹھاتے ہیں کہ آیا وہ قابل تقسیم ہے یا نہیں۔ آیا اس میں وسعت ہے یا نہیں ؟ اور یہ ثابت کرکے کہ تقسیم ہر گز ایک عملِ لامتناہی نہیں ہوسکتا وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ایک مقام ایسا آجاتا ہے جہاں مزید تقسیم ناممکن ہوجاتی ہے اور ذرہ ناقابل تقسیم ہوجاتا ہے۔

اس کے بعد وہ یوں رقمطراز ہوتے ہیں۔

مادہ کا انتہائی جزو یعنی ذرہ یا تو وسعت رکھتا ہے یا نہیں رکھتا۔ اگر اس میں وسعت ہے تو انسانی ذہن کے لئے اس کے متعلق ایک لا متناہی سلسلہ تقسیم تصور کرنا غیر ممکن نہیں ہے۔ لیکن ہم نے ثابت کیا ہے کہ یہ ایک امر محال ہے۔ لہذا ایک ہی نتیجہ ہے جس تک ہم پہنچ سکتے ہیں یعنی یہ کہ اس میں وسعت نہیں ہے۔ پس ثابت ہوا کہ تمام اجسام ایسے ذروں سے بنے ہیں جن میں وسعت نہیں، یعنی جن میں طول عرض اور بلندی نہیں۔ لیکن ایک متعین جگہ رکھتے ہیں۔ اور اس امر میں وہ ریاضی کے اعداد کے مشابہ ہیں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر ہستی رکھتے ہیں اور موخر الذکر موہومہ ہیں۔

یہ وہ حیرت انگیز نتیجہ ہے جہاں ہمارے مصنف صاحب کا استدلال انہیں پہنچا دیتا ہے اور اس بنیاد پر وہ اپنی تمام دلائل اور بحث کی عمارت کو تعمیر کرتے ہیں کیونکہ وہ اسے اپنی کتاب کے جسے وہ مادہ پرستی کے خلاف ایک قاطع اور ساطع دلیل تصور کرتے ہیں شروع ہی میں بیان کرتے ہیں۔ اور وہ اس کتاب سے امید رکھتے ہیں کہ وہ دینِ اسلام کی حقیقتوں کو ایسی واضح اور قابل یقین صورت میں پیش کرے گی جیسے کے ریاضی کی حقیقتیں ہیں جن کے متعلق کسی کو کلام نہیں۔ یقیناً وہ تناقضات (اگر کوئی ہوں بھی) جو مسئلہ تثلیث سے وابستہ سمجھے جاتے ہیں ان تناقضات کے مقابلہ میں جو اس دلیل بازی میں پائے جاتے ہیں کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ وسعت (یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تمام اسلامی فلسفہ امرزیر بحث میں ہمارے ان موجد الفاظ واصطلاحات کے بالکل بر خلاف ہے. ال فودالی کے "متن" میں وسعتِ مادہ ایک مسلمہ حقیقت تصور کی جاتی ہے جس کے معنی کو اس کا مفسرین الفاظ کو اور بھی صاف کردیتاہے "مادہ " خواہ ذرہ ہو یا مرکب .) مادہ کا امتیازی وصف ہے ۔ لیکن ہمارے دوست فرماتےہیں کہ مادہ ایسے اجزا سے بنتا ہے جن میں وسعت نہیں۔ لیکن وہ ذرے مل کر ایک ذی وسعت چیز بنادیتے ہیں لیکن وہ چیز جس میں وسعت یا پھیلاؤ نہ ہووہ قیمت میں صفر ہے اور صفر صفر آپس میں کتنی ہی دفعہ کیوں نہ جمع کئے جائیں حاصل جمع ہمیشہ صفر رہے گی۔ لیکن ہمارے مصنف صاحب کے جو مسیحی منطق کی اس قدر تضحیک کرتےہیں علم حساب کی رو سے اگر کافی تعداد میں (وہ تعداد ذرا ہمیں بھی بتلادیتے)صفر جمع کئے جائیں تو ایک عدد بن جاتا ہے ۔ ہم ان پوچھتے ہیں کہ کتنے بغیر وسعت کے ذروں کو دوش بدوش رکھنے سے ایک انچ چوڑا خط تیار ہوسکتا ہے ؟ اسی قسم کے کئی بے معنی نتائج مصنف موصوف کے بیان سے اخذ ہوسکتے ہیں ۔ لیکن ہم اسی ایک پر اکتفا کریں گے ۔ کیونکہ ہمارا مقصد اس جگہ صاحب مذکور کی غلط بیانی کی تصحیح کرنا نہیں ہے اور نہ ہی ہم اس جگہ مادہ کی اصل اور ماہیت پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں صرف یہ دکھلانا ہے مقصود ہے کہ ہمارا محدود ذہن جب انتہائی منازل پر پہنچ جاتا ہے تو لازماً طرح طرح کے تناقضات سے گھر جاتا ہے۔

لیکن مسئلہ تثلیث میں اس قدر مشکلات حائل نہیں ہوتیں۔ اگر ہم اس نتیجہ پر جہاں ہم غایت درجہ کے دماغی غور وفکر کے ساتھ پہنچ چکے ہیں کامل استقلال اور تعظیم کے ساتھ جمے رہیں یعنی یہ کہ اس عجیب اور نئی حقیقت کا جس کا مشرح بیان پہلے ہوچکا ہے اطلاق

ذات الٰہی پر بھی ہوسکتا ہے اور تسلیم کرلیں کہ اس میں ایک روحانی نظام پایا جاتا ہے ۔ تو ہم اس آخری معمے کو بھی جو بہت مشکل معلوم ہوتا ہے حل کرلیں گے ۔

ہر ایک زندہ نظام میں کل کا جوہر اجزا کے عمل میں کام کرتا ہے ۔ لیکن تو بھی ایک جزو کا اپنا اپنا علیحدہ کام بھی ہوتا ہے۔ اگر میری آنکھ دیکھتی ہے تو گویا میں دیکھتا ہوں ۔ لیکن میرا کان نہیں دیکھتا۔ تاہم میں اس سے یہ نتیجہ نہیں نکال سکتا کہ میں ایک ہی وقت میں دیکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی دیکھتا ۔ بلکہ ہم یہ کہیں گے کہ میں میں اپنی آنکھ کے ذریعہ دیکھتا ہوں نہ اپنے کان کے ذریعہ۔ آنکھ کے عمل سے کل کو جس میں کان بھی شامل ہے فائدہ پہنچتا ہے ۔

اگر ایک جزو کوئی کام کرتا ہے تو کل کرتا ہے اور باقی تمام اجزا کی اس کام میں مشارکت ہوتی ہے۔ لیکن اس سے ہر گز یہ مترشح نہیں ہوتا کہ اس نظام میں ہر ایک جزو کے جداگانہ فرائض نہیں۔ اگر ایک جزو کو تکلیف ہوتی ہے تو نظام کو دکھ ہوتا ہے اور اس دکھ میں تمام اجزا شریک ہوتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے ہر ایک جزو اپنے اپنے دکھ اور تکلیفات جداگانہ بھی محسوس کرتا ہے ۔ لہذا اندریں حالات ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی گریز نہیں کہ ذہن انسانی کے سامنے ایک ایسی منزل آجاتی ہے کہ ہمارے معترض کا اعتراض کہ ایک ہی جزو ایک وقت میں کام کرتا بھی ہے اور نہیں بھی کرتا بالکل درست معلوم ہوتا ہے ۔

روحانی نظام کی حقیقت کا ذاتِ الٰہی پر اطلاق کرنا اس کی ماہیت کا بہترین تصور ہے کیونکہ صرف اس ہی صورت میں ہم خدا کو ایک زندہ اور صاحب شخصیت خدا مان سکتے ہیں۔ لیکن یہ تصور اعلیٰ ترین تصور خدا ہے مگر درحقیقت خدا اس سے بھی کہیں اعلیٰ اور بالا ہے ۔ یہ تصور ہمارے اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ گو اقانیم تثلیث میں سے ہر ایک اقنوم کے جداگانہ فرائض ہیں مگر تو بھی ہر حالت میں خدا خود واحد اور لا تبدیل کام کرنے والا ہے ۔ خدا کو بلاریب یہ اختیار ہے کہ وہ اپنے کلمہ یعنی بیٹے میں ہو کر تجسم اختیار کرے اور یہ تجسم باپ اور روح سے منسوب نہ کیا جائے لہذا ان معنوں میں مجسم اقنوم نجات انسانی کے کام میں ایک خاص جگہ رکھتا ہے ۔

وہ احدیت ، باہمی اشتراک وموافقت جو ذات الٰہی میں ہے ضرور ہی بیان وفہم سے باہر ہوگی جب کہ ایک معمولی نظام زندگی کا سمجھنا ہمارے لئے مشکل ہے جس میں عجیب اتحاد اور یگانگت نظر آتی ہے اور تمام مختلف اعضا آپس میں ایسے وابستہ دکھائی دیتے ہیں کہ ایک دوسرے میں اور ایک دوسرے کے ساتھ زندہ رہتے ہیں اور سب میں ایک ہی جوہر جو ناقابل تقسیم ہے کام کرتا ہے۔ یہ باہمی موافقت اور یک جہتی خدائے ازلی ، غیر فانی اور لامحدود کی ذات میں کاملیت کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے لہذا اس نکتہ خیال سے مسئلہ تثلیث پر کوئی حجت ثابت نہیں ہوتی۔ یوں معترضین کا آخری اعتراض بھی رد ہوجاتا ہے ۔

باب دوم

خدا بحیثیتِ خالق
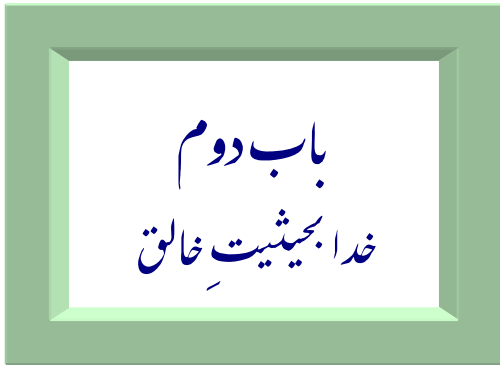
ان مختلف اعتراضات کا جو مسئلہ تثلیث پر ہوسکتے ہیں جواب دینے کے بعد ہم یہ ثابت کریں گے کہ مسئلہ تثلیث سے ایک زندہ خدا پر اعتقاد لانا مشکل نہیں ہوجاتا بلکہ برخلاف

اس کے کئی مشکلات کا جو خدا کی وحدتِ محضہ کے ماننے والوں کے جن میں اہل اسلام بھی ہیں سامنے آجاتی ہیں حل مل جاتا ہے ۔ ان معموں میں سے سب سے زیادہ پریشان کرنے والا معمہ یہ ہے کہ خدا نے جو محتاجِ غیر نہیں دنیا کو کیوں خلق کیا ؟ اور کیا خلق کرنے کے بعد اس کے محتاج غیر نہ ہونے کی صفت اسی طرح قائم رہتی ہے ؟ اہل اسلام اس مشکل کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں۔ فیلسوفوں کی تعلیمیں جن میں صدور اور اقدامات عالم کے مسئلوں پر بحث کی گئی ہے اور صوفیوں کی ایسی حدیثیں (مثلاً کنت کنزاً محّفیاً لمہّ عرفاا جبتو ا عن عرفاخلقتوا خّلقاً ولو ّ عرفتو اا لیھمہ فی عرفونی . ترجمہ .میں ایک نامعلوم گنج مخفی تھا. تب میں نے معلوم کئے جانے کی خواہش کی . اس لئے میں نے مخلوقات کو پیدا کیا تاکہ اس سے جانا جاؤں اور مجھ ہی سے انھوں نے مجھ کو جانا)۔ جن میں ذکر آتا ہے کہ خدا اپنے آپ کو ظاہر کیا چاہتا تھا اس لئے اس دنیا کو خلق کیا۔ یہ تمام باتیں اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ علمائے اسلام کو اس مشکل کا حل سوچنے میں بہت سر دردی کرنی پڑی ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بہت سے خدا پرست لوگوں کے ملحد اور منکر ہوجانے کی وجہ یہی مشکل رہی ہے ۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ مسئلہ تثلیث ذات الہٰی سے متعلق بہت سی مشکلات کو دور کردیتا ہے۔

آئیے ہم مختصر طور پر پھر ان مشکلات کا ملاحظہ کریں جو تصورِ خدا کے متعلق اسلامی تعلیم توحید کے سامنے آتی ہیں۔

اول ۔خدا کیونکر مخلوق کی صورت اختیار کرنے کے بعد بھی خالق رہ سکتا ہے ؟ کیا ایسا کرنے سے ہم واجب الوجود خدا کو حادث قرار نہیں دیتے ؟

دوم ۔ آفرینش عالم سے پہلے خدا کی تمام قوتیں سکون کی حالت میں نہیں۔ وہ خلقت کی تخلیق کے وقت کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ قوتیں بیدار نہ تھیں بلکہ خواب کی حالت میں پڑی تھیں۔ مخفی تھیں اور کوئی عملی حقیقت نہ رکھتی تھیں۔ کیونکہ کسی فعل کے کرنے کی قابلیت رکھنا اور اس فعل کے کرنے میں آسمان اور زمین کا فرق ہوتا ہے ۔ محض قابلیت عمل کے مقابلہ میں ناقص سمجھی جاتی ہے ۔ چنانچہ اگر ہم یہ کہیں کہ خدا کی مخفی اور سوئی ہوئی قوتِ تخلیق کو متحرک اور ظاہر کرنے کے لئے دنیا کا خلق کیا جانا ضروری تھا تو ہم ایسا کہنے سے اس میں نقص اور کمزوری ثابت کرتے ہیں اور اسے محتاج غیر بتلاتے ہیں۔

سوم ۔اس حالت میں دنیا کے خلق کرنے سے خدا میں نسبتیں ثابت ہوتی ہیں۔ یعنی اس میں اور اس کی پیدا کی ہوئی دنیا میں تعلق اور رشتہ ہوجاتا ہے ۔ لیکن ان تعلقات کا آغاز اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خداوند تعالیٰ ایک نئی قسم کی زندگی شروع کرتا ہے ۔ لیکن یہ خیال تنزیح کے بالکل خلاف ہے ۔

چہارم۔ تعلق رکھنا گویا طرفین کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا ہے مثلا" سننے والا ایک عمل سے اثر پزیر ہوتا ہے ۔ اور یہ تنزیح کے خلاف ہے ایک واجب الوجود خدا کیونکر اپنے آپ کو محدود کرسکتا ہے ۔

مسئلہ تثلیث ان مشکلات کو بالکل اگر دو نہیں کردیتا ہے تو آسان ضرور کردیتا ہے اور خدا کے متعلق ذیل کی اہم حقیقتیں ہمارے سامنے رکھتا ہے۔

(الف) مسئلہ تثلیث ہم پر ایک ایسے خدا کو ظاہر کرتا ہے کہ جس میں سوئی ہوئی اور مخفی طاقتیں نہیں پائی جاتیں بلکہ ایسی قوتیں نظر آتی ہیں جو ازل سے کام کررہی ہیں ۔ محبت اس کی ہستی کی مرکزی صفت ہے جو اس میں ہمیشہ سے کام کرتی ہوئی دکھلادیتی ہے ۔

چنانچہ خدا کی کوئی قوت یا قابلیت ایسی نہیں جو پہلے کام نہ کررہی ہو اور دنیا کے خلق کئے جانے کے وقت کام کرنے لگ جائے ۔ تخلیقِ عالم ایک ایسا عمل ہے جو خدا کی ہمیشہ کام کرنے والی فطرت کے مطابق ہے ۔ دنیا کا پیدا کیا جانا اس کی محبت کا نتیجہ تھا ۔ وہ محبت دوسروں کی ہستی اور خوشی کا موجب ٹھہری لہذا دنیا کا وجود اس انتہائی محبت کا نتیجہ ہے نہ کسی قوت کا کیونکہ محبت محض اپنے مقصد پر نظر رکھتی ہے اور قوت وسائل کو جن سے وہ مقصد حاصل ہوسکے ملحوظ رکھتی ہے ۔ یہی وہ بڑا فرق ہے جو مسیحی اور اسلامی تصوراتِ خدا میں پایا جاتا ہے ۔ اسلام کی رو سے ارادہ اور قدرت دو خاص الہی اوصاف ہیں جن کے تابع وہ تمام تعلقات ہیں جو وہ انسان اور دنیا سے رکھتا ہے ۔ لیکن مسیحی مذہب کہتا ہے کہ خدا محبت ہے اور ارادہ اس محبت کے اظہار کا ایک وسیلہ ہے۔ اور قدرت اس محبت کی ایک خادمہ ہے ۔ خدا کا جلال بھی اس کی محبت کی طبعیت کا ایک منور پہلو ہے ان تمام باتوں سے اسلام بالکل ناآشنا ہے ۔ وہ خدا کو محض ایک غیر ذمہ دار حاکم تصور کرتا ہے ۔ خدا کے باپ ہونے کی تعلیم جو سیدنا مسیح نے دنیا پر ظاہر کی اس قسم کے ادنے تصور خدا کی کامل تردید کردیتی ہے ۔

(ب) تثلیث کی تعلیم اس بات کو بھی ظاہر کرتی ہے کہ دنیا کے خلق کئے جانے کے وقت خدا کوئی نئے تعلقات قائم نہیں کرتا ۔ کیونکہ اس کی ذات میں توازل سے اعلیٰ ترین تعلقات کا پیدا کرنا محض اس فطرت خدا کا عکس ہے جس میں ازلی تعلقات پائے جاتے ہیں۔

(ج) مسئلہ تثلیث ان مشکلات کو بھی حل کردیتا ہے جو اس وقت لازماً حائل ہوجاتی ہیں۔ جب ہم تخلیق کو خدا سے منسوب کرتے ہیں اور وہ مشکلات یہ ہیں کہ جب ہم کہتے ہیں کہ خدا نے دنیا کو خلق کیا تو ہمیں نتیجہ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خدا اثر پذیر ہوا ، محدود ہوا ، اس نے کسی جذبہ کے ماتحت کام کیا۔ اور کہ خلق کرنے سے پیشتر اس کی تمام طاقتیں بیکار اور بے حس وحرکت پڑی ہوئی تھیں۔ لیکن ہمارے لئے یہ مشکلات کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ کیونکہ جس طرح ہم نے یہ دریافت کرلیا ہے کہ تعلقات رکھنا خدا کا ایک وصف خاص ہے اسی طرح ہم یہ بھی جان گئے ہیں کہ محدودیت محض تعلقات رکھنے کا دوسرا نام ہے ۔ تمام تعلقات ایک قسم کی حدود ہیں۔ ان میں حرکت وسکون ، عمل اور عمل سے متاثر ہونا پایا جاتا ہے ۔ خدا میں جو باپ ، بیٹا اور روح القدس ہے یہ تمام باتیں پائی جاتیں ہیں۔ پس ہم ان باتوں سے کیوں ڈریں ۔ سچی محبت اور حقیقی آزادی میں حدود کی پابندی ضرور پائی جاتی ہے ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خدا اپنی محبت اور کامل آزادی کو ظاہر کرنے کے لئے خود اپنے آپ کو محدود کرلیتا ہے ۔ اور نجات انسانی کی خاطر کام کرتا ہے اور اثر پزیر بھی ہوتا ہے ۔ یہ تمام باتیں خدا کی ذات میں ازل سے پائی جاتی ہیں کیونکہ وہ محبت ہے ۔ اس لئے کہ وہ باپ ، بیٹا اور روح ہے ۔ اسی طرح یہ کہنا کہ کسی وقت خدا کی قوتیں حالت سکون میں تھیں خلاف شان ایزدی نہیں ہے ۔ خدا میں حرکت وسکون دونوں ہیں۔ انسان کی مخلصی کے لئے دونوں کی ضرورت ہے ۔ محبت ہردو کی مقتضیٰ ہے ۔

یہی بات جذبات کے متعلق کہی جاسکتی ہے ۔ انسانی دل ضمیر اور اخلاقی ضروریات تمام کسی دور افتادہ خدا کو نہیں چاہتیں بلکہ ایک ایسے خدا کی حاجت مند ہیں جو ہمیشہ صاحب احساس ہو۔ لیکن انسانی دماغ اس ضرورت کا اعتراف کرنے سے ہمیشہ ڈرتا رہا ہے اور ہمیشہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے کہ خدا اعمال وتکلیفات انسانی سے ہرگز متاثر نہیں ہوتا۔ لیکن تعلیم تثلیث جو محبت کے خدا کو پیش کرتی ہے اس قسم کے خوف کو

بے بنیاد قرار دیتی ہے ۔ کیونکہ محبت بہترین قسم کی زندگی ہے ۔ لہذا وہ جذبات جو محبت سے تعلق رکھتے ہیں ۔ خدا کی ازلی اخلاقی زندگی کا حصہ خاص ہیں۔

پس ہم نے دیکھا ہے کہ وہ عقدہ جو وحدانیت کے ماننے والوں کو پریشان کرتا ہے یعنی یہ کہ تخلیق عالم کے وقت سے اثر، محدودیت، سکون اور جذبات کا اطلاق خدا پر ہوسکتا ہے جو اس کی ذات میں نقص اور کمزوری ثابت کرتا ہے مسئلہ تثلیث سے بالکل صاف ہوتا ہے یہ خدا کے لئے کوئی نئی باتیں نہ تھیں اور نہ ہی اس کی شان کے خلاف تھیں۔ یہ باتیں دنیا کے خلق کرنے سے پہلے بھی موجود تھیں۔ وہ اس کی زندگی اور ہستی کا حصہ تھیں اور ان میں وہ اپنے آپ کو ظاہر کرتا تھا۔ لہذا جب وہ اپنی مہربانی سے دنیا کو خلق کرتا ہے اور اس دنیا کے ساتھ تعلق پیدا کرتا ہے اور ان تمام قیود اور حدود کو گوارہ کرتا ہے جو باہمی تعلقات کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں یعنی اپنے آپ کو خود محدود کردینا ۔ اثر پذیر ہونا ،حالت سکون میں رہنا اور احساس وجذبات رکھنا وغیرہ تو وہ کوئی نئی بات نہیں کرتا وہ صرف اپنی فطرت اور طبعیت کو جو وہ ازل سے رکھتا ہے چلا آیا ہے ایک خاص وقت پر ظاہر ہوتا ہے ۔ فطری دنیا کی تخلیق کے متعلق بہ آسانی کہا جاسکتا ہے کہ خدا نے اپنے آپ کو کسی معنی میں بھی محدود نہیں کیا۔ کیونک فطری دنیا پورے طور سے اس کے تابع ہے اور فعل مختار نہیں ہے اور اس کی ادنیٰ سی حرکت بھی خدا کے حکم سے باہر نہیں ۔ لہذا غیر جانبدار ہونے اور ارادہ نہ رکھنے کی وجہ سے اس میں اس کے خالق میں کوئی نزدیکی مشابہت نہیں۔لیکن انسان کے متعلق جو صاحب عالم ارادہ واحساس ہے ایسا نہیں کہا جاسکتا ۔ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی مرضی اور انسان کی مرضی خدا کے دماغ اور انسان کے دماغ ،خدا کے علم اور انسان کے علم میں کوئی مشابہت نہیں۔ اگر یہ مشابہت نہ ہو توخدا کیونکر انسان پر اپنے آپ کو ظاہر کرسکتا ہے ۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ جب تک متکلم اور مخاطب میں چند ایک مشترکہ اوصاف نہ ہوں طرفین کو ایک دوسرے کی بات ہرگز سمجھ نہ آئے گی۔

بیلوں کی نظر میں قدیم مصری تحریر صرف چند نشانات ہیں۔ اس سے بڑھ کر ان کے نزدیک اس کی کوئی وقعت نہیں ہوسکتی ۔ لیکن ہمارے لئے وہ نشانات معانی سے پُر ہیں کیونکہ ہمارے دماغ میں اور ان کے لکھنے والوں کے دماغ میں مشابہت پائی جاتی ہے ۔ مکاشفہ اور الہام سے ہم ہرگز کوئی فائدہ نہ اٹھا سکتے اگر ہمارے اور خدا کے دماغ میں مشابہت نہ ہوتی۔ گو اقتضائے تنزیح اس قسم کی مماثلت کے ماننے کی اجازت نہیں دیتا لیکن وہ خدا اور انسان کے مابین تعلقات کے امکان کو تسلیم کرتاہے۔ کیا ان دونوں باتوں میں تضاد وتخالف نہیں ؟اگر اسلام اس کا یہ جواب دے کہ دنیا جس میں انسان بھی شامل ہے قدرت خدا کے ہاتھ میں ایک اوزار کی مانند ہ توہم کہیں گے کہ بہت سی مشکلات جن کا اوپر ذکر کرچکا ہے اسی طرح قائم رہتی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ اعتقاد خدا سے محبت کی صفت کو بالکل علیحدہ کردیتاہے ۔ کیونکہ کوئی بھی ایک مشین کو خواہ وہ اس پر پوری قدرت اور اختیار کیوں نہ رکھتا ہو پیار نہیں کرسکتا ۔اور مشین کے لئے تو اور بھی زیادہ مشکل ہے کہ وہ اپنے بنانے والے کو پیار کرسکے ۔اور اگر یہ بھی فرض کرلیا جائے کہ وہ مشین صاحب عقل وہوش ہے اور اپنے بنانے والے کی مرضی کو جو وہ اس پر ظاہر کیا چاہتاہے سمجھتی ہے تو بھی اس سے یہ توقع کرنا کہ وہ اسے پیار کرسکے محال ہے ۔

لیکن یہ فرض ہی کرنا کہ مشین صاحبِ عقل وفہم ہوسکتی ہے خلاف تنزیح ہے ۔ ایک طرف تو تنزیح کی رو سے انسان کا صاحب ارادہ اور فعل مختار ہونا ناممکن ہے اور دوسری طرف اس کا صاحبِ عقل ہونا اور اس عقل کو کام میں لانا ممکن ہے ۔ یہ معمہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا ۔ یا تو آپ یہ مانیں کہ انسان میں عقل ہے اور وہ اس عقل کو خود استعمال

کرسکتا ہے یعنی اپنا مطلب سمجھا سکتا ہے اور دوسرے کا مطلب سمجھ سکتا ہے۔ اور جب آپ نے یہ مان لیا تو آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خدا کا علم نہ صرف موثر کرتا ہے بلکہ خود بھی متاثر ہوتا ہے۔ نہ صرف اپنے پیغام دوسروں تک پہنچاتا ہے بلکہ دوسروں کے پیغام اپنے تک پہنچنے دیتا ہے۔ نہ صرف جانتا ہے کہ بلکہ جانا جاتا ہے اور تمام باتیں تنزیح کے بالکل خلاف ہیں۔ یا آپ کو یہ کہنا پڑے گا کہ انسان کی عقل ایسی ہی بے حقیقت ہے جیسے اس کی مرضی۔ یعنی گو وہ سنتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن در حقیقت خود خدا اپنی باتیں سنتا ہے۔ وہ بولتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن در حقیقت بولنے والا خدا ہے جو خود اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے۔ گو وہ بظاہر علم رکھتا ہے لیکن در حقیقت خواب دیکھ رہا ہے۔ اس طرح اس کی شخصی عقل و فہم محض ایک دھوکا ہیں۔ اس کی شخصیت اور انفرادیت کافور ہوجاتی ہیں اور وہ ناول کے ایک تشخص کی طرح رہ جاتا ہے جو چلتا پھرتا، بولتا اور سوچتا تو دکھائی دیتا ہے لیکن در حقیقت مصنف کے دماغ سے باہر اس شخص کی کوئی ہستی نہیں۔ لہذا اگر مطالبات تنزیح اور تخلیق فطرت میں کوئی مطابقت نہیں ہوسکتی تو انسان جیسی روحانی ہستی کے خلق کرنے کے تصور اور اقتضائے تنزیح میں کیونکر تطابق ہوسکتا ہے۔

لہذا اسلامی خیال کی تاریخ میں بہت دفعہ دیکھنے میں آئے گا کہ وہ لوگ جنہوں نے تنزیح پر حد سے زیادہ زور دیا ہے اس بات کے ماننے پر بھی مجبور ہوئے ہیں کہ محض اللہ ہست ہے اور باقی تمام چیزیں جو ہست ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں بجز دھوکا و فریب اور کچھ نہیں ہیں۔ یہی خیال اس نام کی تہ میں بھی نظر آتا ہے جو وہ خدا کو دیتے ہیں یعنی " الحق " اس سے ان کی یہ مراد ہے کہ بجز خدا کے اور کوئی چیز ہستی اور حقیقت نہیں رکھتی۔ یہ لوگ در حقیقت ہمہ اوستی کی تعلیم کے معتقد ہیں اور ان کے خیالات ہندی فلسفہ ہمہ اوستی کے مشابہ ہیں جس کی رو سے تمام چیزیں جو ہمیں نظر آتی ہیں مایا ہیں۔ ان لوگوں کی اصطلاح میں توحید کے معنی محض خدا کی وحدت کا قائل ہونا نہ تھا بلکہ اسی اکیلے کو ہست جاننا تھا۔ یعنی ان کی نظر میں کائنات کی تمام چیزیں بے حقیقت اور بے وجود تھیں۔

یہ وہ چند اخلاقی اور دماغی مشکلات ہیں جن کا اسلامی تعلیم خدا کو مقابلہ کرنا پڑتا ہے لیکن یہ تمام مشکلات پل بھر میں غائب ہوجاتی ہیں جب ہم اس خدا کا تصور کرتے ہیں جو مسیح نے ہم پر ظاہر کیا ہے اور اسے باپ بیٹا اور روح مانتے ہیں۔ ہم نے دیکھا لیا ہے کہ کس طرح سے خدا کو تثلیث کے تصور کے مطابق محبت ماننے سے اس کا خالقِ دنیا ہونا آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے اور جب ہم اس پر خالق انسانی ہونے کی حیثیت میں غور کرتے ہیں تو اور بھی زیادہ آسانی ہوجاتی ہے کیونکہ تمام مخلوقات میں انسان ہی ایسا مخلوق ہے جو دور اندیشی اور قوتِ حافظہ رکھتا ہے۔ جو نہ صرف اپنے آس پاس کے لوگوں اور چیزوں کی واقفیت رکھتا ہے یا یوں کہیں کہ (جہاں تک ہم جانتے ہیں) تمام کائنات میں انسان ہی اکیلی ذی روح ہستی ہے اور دعا شکر یہ اور محبت کرنے کا اہل ہے یا بالفاظ دیگر خدا نے اسے ان اوصاف کے لحاظ سے "اپنی صورت پر" بنایا ہے اس ضمن میں ذیل کی باتیں قابل غور ہیں۔

(1) اگر خدا انسان کو تو محبت کی اعلیٰ صفت سے متصف کردیتا ہے اور خود اس سے محروم رہتا ہے تو مخلوق خالق سے بڑھ جاتا، کیونکہ محبت دنیا میں سب سے بڑی چیز ہے" لیکن ہم ثابت کرچکے ہیں کہ خدا میں محبت ہے بلکہ خدا خود محبت ہے لہذا ایک محبت کرنے والے مخلوق کا پیدا کرنا کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔

(2) اگر مخلوقات کے کوئی معنی ہیں تو ضرور ہے کہ اس کی علتِ غائی خدا کا جلال ظاہر کرنا ہو۔ جلال سے ہمارا مطلب طاقت نہیں کیونکہ طاقت کو ظاہر کرنا محض دکھاوا ہے بلکہ جلال سے مقصود اس کی محبت ہے اور وہ قدرت جو اس کی محبت میں ظاہر ہوتی ہے۔

لہذا تخلیق کا کام بالکل ناتمام رہ جاتاہے اگر خدا نظامِ شمسی یاعالم جمادات یا نباتات ہی کے بنانے پر اکتفا کرتا۔ کیوں ؟ اس لئے نہیں کہ یہ چیزیں کافی طور پر عجیب وغریب اور حیرت افزا نہیں بلکہ اس لئے کہ یہ چیزیں خدا کو جان نہیں سکتیں۔ اسے پیار نہیں کرسکتیں ۔اس کا جلال ظاہر نہیں کرسکتیں اس کی مانند نہیں بن سکتیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ خدا نے حیوانات کے خلق کرنے کو بھی کافی نہ سمجھا بلکہ آخر میں انسان کو بھی بنایا۔ انسان اشرف المخلوقات ہے ۔ انسان میں پہنچ کر مخلوقات اس طرح سے بیدار ہوجاتی ہے جیسے کوئی بے خبر سویا ہوا شخص جگادیا جائے ۔ انسان ہی ایک ایسا مخلوق ہے جس سے خدا بات چیت کرسکتا ہے اور جو خدا سے ہم کلام ہوسکتا ہے یا یوں کہیں کہ جو اس کے مشابہ ہے۔

اہلِ اسلام کی نظر میں یہ مماثلت خدا کی کسرِ شان ہے کیونکہ وہ خدا کو ہر حالت میں بے مثل مانتے ہیں۔ لیکن اس مشابہت کا انکار کرنے سے انہیں ایک اور بڑی حقیقت کا انکار کرنا پڑتاہے ۔اور وہ حقیقت یہ ہے کہ خدا اور انسان کے درمیان رشتہ محبت ہونا ممکن ہے ہم اس بات کو ثابت کرچکے ہیں کہ خدا اور انسان کے درمیان رشتہ اور تعلق ہونے کے لئے روحانی مشابہت کا ہونا لازمی اور ضروری ہے ۔ چنانچہ ہم بائبل مقدس کے شروع ہی میں ذیل کے الفاظ پاتے ہیں۔

"خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیاہے "۔

یہ الفاظ بائبل مقدس کے الہام کی ایک قوی دلیل ہے اسی طرح انجیل شریف میں بھی آیاہے "نئی انسانیت ۔۔۔۔۔۔جو۔۔۔۔۔اپنے خالق کی صورت پر نئی بنتی جاتی ہے "۔ اس میں شک نہیں کہ پیدائش کی کتاب سے ان الفاظ کو اہلِ اسلام نے ایک حدیث کی صورت میں ماناہے۔ یہ حدیث مختلف زمانوں میں مسلم ماہرین الہیات کو بڑی پر کشش معلوم ہوتی رہی ہے لیکن موجب حیرت وپریشانی بھی رہی ہے ۔اگر کوئی یہ دیکھنا چاہے کہ کیونکر مسلم علماء نے اس حدیث کے معنی کو گول مول صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے تو وہ الغزالی کی مشکواۃ الانور (صفحہ 34تا35) کا ملاحظہ کریں۔ ہم اس حدیث سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اہلِ اسلام کے دل میں بھی یہ خواہش اور آرزو ہے کہ خدا اور انسان کے درمیان ایک زیادہ نزدیکی تعلق قائم ہوجائے۔ لیکن یہ خواہش جوہر ایک انسان کے دل میں ہے مسلم علم الہیٰ میں نہیں بلکہ مسیحی الہیات میں پوری ہوتی ہے یہ بات بھی کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ مسئلہ تثلیث میں پہلے ہی سے پائی جاتی ہے۔

خدا ازل ہی سے اپنے بیٹے اور کلمہ میں اپنی " ذات کا نقش " دیکھتا تھا(انجیل شریف خطِ عبرانیوں 1 باب 2آیت)لہذا ایسی دنیا کا خلق کرنا جس کے اعلیٰ ترین طبقہ میں وہ محدود صورت میں اپنی " ذات کا نقش " دیکھ سکے کوئی نئی اور حیران کرنے والی بات نہیں ہے ۔ بلکہ عین اس کے جوہر(ہم مسئلہ تثلیث کی تعریف یا تشریح جو چیخو (Fatherl Cheikho)صاحب نے اپنی کتاب "تفنید التزویر الحمد طاہر التنویر (Refutation of the Falsification of Muhammad Thair El Tanwir)میں زبردست کتاب العقائد الوزنیہ فی الانتباہ النصرانیہ کا جس میں ایک مسلم نے مسیحیت پر زبردست حملہ کیاہے چنانچہ جواب تحریر ہے جو اس جگہ لفظ بلفظ نقل کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ تعریف بڑی دلچسپ اور مفید ہے۔

"خداجو کہ واحد کامل جلال والا اور ناقابل تقسیم ہے وہ ایک ذی عقل معبود ہے جو اپنی الہیٰ ذات کی حقیقت سے ازل سے واقف ہے اور اس حقیقت کی کامل واقفیت کےذریعہ وہ اس صورت کو اپنی تمام کاملیت دے دیتا ہے ۔ایسا کہ گویا خدا ایں اور اس میں کوئی بھی فرق نہیں ہے ۔ لیکن ایسا کرنے سے اس کے جوہر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس کاملیت کا حاصل کرنے والا اس کا ازلی کلمہ ہے جو مخلوق نہیں ہے ۔ اور چونکہ وہ خدا سے صادر ہوتا ہے اور ازل سے اس کے ذہن میں موجود ہے کسی خاص وقت یا کسی خاص جگہ ظہور پذیر نہیں ہوتا اس لئے ہم اسے کلمہ اور خدا کو باپ کہتے ہیں ۔ جس طرح سے ہم اپنے غور وفکر اور عقل وہنر کے نتیجہ کی نسبت کہہ

سکتے ہیں کہ یہ ہمارے خیالات کا بیٹا ہے یعنی ہمارے خیالات نے اسے جنم دیا ہے یا اسے کلمہ کے نام سے نامزد کرسکتے ہیں۔ اس کلمہ کو جو ہمارے منہ سے نکلتا ہے ہماری عقل سے ہر گز قطع تعلق نہیں ہوجاتا۔
فرق صرف اتنا ہے کہ ہمارا کلمہ ہماری فطرت کا ضروری حصہ نہیں ہے بلکہ فروعات میں سے ہے لیکن خدا میں فروعات نہیں ہیں۔ لہذا ہمیں ماننا پڑے گا کہ خدا کا کلمہ اتنا ہی خدا ہے جتنا اس کا مصدر خدا ہے۔ پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ چونکہ بیٹا باپ کی اصل صورت ہونے کی وجہ سے اس کے عین مشابہ ہے لہذا باپ میں اور اس کے کلمہ میں کوئی ایسا رشتہ ہونا چاہیئے جس رشتہ کے ذریعہ باپ اپنی صورت سے محبت رکھ سکے اور وہ صورت اپنے مصدر سے محبت رکھ سکتے ۔ اور یہ رشتہ بھی ایک حقیقت اور جوہر ہے جسے ہم روح القدس کہتے ہیں اور جو باپ اور بیٹا دونوں سے صادر ہوتی ہے۔) اور اوصاف کے مطابق ہے۔

ہم مسئلہ تجسم کے مختلف پہلوؤں پر بحث نہ کریں گے بلکہ جیسا ہمارا مقصد ہے محض یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ خلاف عقل نہیں ہے اور یہ بھی ظاہر کریں گے کہ مسئلہ تجسم کو ماننے سے خدا پر اعتقاد رکھنا مشکل نہیں بلکہ آسان ہوجاتاہے اور اگر اسے نہ مانیں تو خدا کی ہستی کا تیقن ایک امرِ محال ہوجاتاہے ۔ ہم ذیل میں وہ اعتراضات رقم کریں گے جو تجسم کے خلاف کئے جاتے ہیں اور پھر ایک ایک کرکے ان کا جواب دیں گے۔

(1) کیا تجسم خاص طور پر بیٹے سے تعلق رکھتا ہے ؟ اگر یہ درست ہے تو آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ خدا مجسم ہے ؟
(2) تجسم کے ماننے سے خدا کا تبدیل ہوجانا ماننا پڑتا ہے۔
(3) تجسم کی تعلیم خدا کو قید مکان میں لے آتی ہے۔
(4) تجسم کی تعلیم خدا کو قید زمان سے لے آتی ہے
(5) مسئلہ تجسم خدا کو کمزور، ساکن اور مبتلائے مصیبت ثابت کرتا ہے۔

اعتراض اول

آیا خدا یا خدا کا بیٹا مجسم ہوا

ہم نے تثلیث کے بیان میں واضح طور پر سمجھا دیا ہے کہ ذات الہیٰ کے تینوں اقانیم کے جداگانہ اور خاص خاص کام ہیں۔ لیکن پھر بھی خدا میں کسی قَسم کی تقسیم ثابت نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تینوں اقانیم علیحدہ علیحدہ بھی ہیں اور مل کر ایک بھی ہیں۔ ہر ایک کام خدا کرتا ہے یعنی ایک الہیٰ ذات سب کچھ کرتی ہے اور ہر سہ اقانیم مل کر اس کی تکمیل کرتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس امر کی عملی انجام دہی کا کام کسی خاص ایک اقنوم کے سپرد نہیں کیا جاسکتا۔
"بیٹا آپ سے کچھ نہیں کرسکتا سوا اس کے جو باپ کو کرتے دیکھتا ہے"۔

یعنی باپ ہر ایک کاارادہ کرتا ہے اور حکم دیتاہے اور اس روحانی کیفیت میں حصہ دار ہوتاہے جو اس خاص کام کے سوچنے اور انجام دینے سے پیدا ہوتی ہے لیکن اس ارادہ اور حکم کی تعمیل کلمہ کا خاص کام ہے ۔ ان دونوں باتوں میں کوئی مخالف نہیں۔ مثلاً دماغ ایک کام عقلی طور پر کرتاہے اور باقی اعضاء اسے عملی جامہ پہنا دیتےہیں۔

جب ہم اس اصول کا اطلاق مسئلہ تجسم پر کرتےہیں تو ہم دیکھتےہیں کہ بیٹا اپنی کامل ذاتِ الٰہی کے ساتھ مجسم ہوتاہے " کلام مجسم ہوا " اس تجسم کے متعلق باپ ارادہ کرتاہے اور تجاویز سوچتاہے اور روح القدس کی مدد سے معرضِ وقوع میں لاتاہے لہذا ہم یہ کہے بغیر کہ باپ یا روح القدس نے ان معنوں میں تجسم اختیار کرلیا جن معنوں میں بیٹے نے اختیار کیاکہہ سکتےہیں کہ خدا مجسم ہوا۔

میں تمام کا تمام اس ہاتھ میں موجود ہوں کہ جس سے میں لکھ رہا ہوں لیکن تاہم میں اس ہاتھ میں محدود اور محصور نہیں ہوجاتا ۔اسی طرح خدا اپنی کامل ذات الٰہی کے ساتھ سیدنا مسیح میں موجود تھالیکن وہ ذاتِ الٰہی ایک شخص بنام مسیح کے جسم میں محدود نہ تھی۔

اگر کوئی اس بات کا انکار کرے کہ میں تمام کا تمام اپنےہاتھ میں موجود ہوں تو میں پوچھوں گا کہ میرا کس قدر حصہ اس ہاتھ میں موجود ہے ۔ کیا میری روح تقسیم ہوسکتی ہے؟ نہیں اسی طرح آپ کو ماننے پڑے گا کہ خدا کامل طور پر مسیح میں موجود تھا لیکن تو بھی مسیح نام شخص میں مقید نہ تھا۔

روح کی ماہیت ایک رازِ سربستہ ہے اور روح کا مادہ کے ساتھ تعلق رکھنا اور بھی زیادہ بعید از فہم ہے ۔ جب یہ حالت انسانی روح اور اس کے تعلقات کی ہے تو اس مخفی رشتہ کا جاننا جو خدا کی لامحدود روح کا مادی اشیاء سے ہے کیونکر ممکن ہوسکتاہے ۔ لہذا ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا پڑتاہے کہ یہ معاملہ جوایک راز ہے ہماری عقل سے بعید توہے لیکن عقل کے خلاف نہیں ۔ یہ اس بڑے بھید یعنی خدا اور دنیا کے باہمی تعلق کا ایک حصہ ہے۔

اعتراض دوم

تجسم اور ہونا

"کلام مجسم ہوا" اس مشہور آیت کے متعلق دو اعتراضات کئے جاتےہیں۔

(1) یہ کہ اس سے خدا کا جسم میں تبدیل ہوجاناثابت ہوتا ہے ۔

(2) یہ کہ اس آیت کی روسے خدا ہمیشہ یکسا نہیں رہتا بلکہ اس میں تبدیلی آجاتی ہے یا یوں کہیں کہ خدا کی ذات میں (ہونا) پایاجاتاہے۔

اعتراض اول کے جواب دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ آیت زیر نظر میں ہر گز یہ الفاظ کہ "کلام جسم میں تبدیل ہوگیا" نہیں پائے جاتے ۔ اسی خیال سے کلیسیا نے تبدیلی کے مسئلہ کورد کردیاہے۔ "خدا کے جسم میں تبدیل ہوجانے سے نہیں بلکہ انسان کو خدا تک لے جانے کے ذریعہ "سے تاہم اس آیت میں لفظ "ہوا"۔ضرور آیاہے۔آئیے ہم اس پر غور کریں۔

درحقیقت یہ معاملہ اس بنیادی مشکل سے تعلق رکھتاہے جو تخلیق اور تعلقات الٰہی کے گہرے بھیدوں سے وابستہ ہے ۔ یہ "ہونا" اس ابتدائی مشکل کاایک پہلو ہے ۔ ہم واضح

طور پر بتا چکے ہیں کہ وہ بنیادی مشکل ہماری نسبت اہل اسلام کو زیادہ پریشان کرتی ہے اور یوں تو ہر ایک کے سامنے آتی ہے جو ایک واحد اور علم رکھنے والے خدا اور خالق کو مانتا ہے ۔ لہذا اہل اسلام کیونکر اس آیت پر اعتراض کرسکتے ہیں۔ کیونکہ جو کوئی یہ مانتا ہے کہ خدا خالق ہے وہ کسی نہ کسی صورت میں "ہونا" خدا سے منسوب کرتا ہے کیونکہ خدا نے دنیا کو شروع ہی میں خلق نہیں کیا تھا۔ بلکہ ایک خاص وقت میں خلق کیا۔ لہذا خدا خالق ہوا خالق اور مخلوق میں تمیز کرنے کی غرض سے ہمیں وقت کے استعار سے استعمال کرنے پڑتے ہیں ورنہ احتمال ہے کہ ہم دنیا کو بھی ازلی اور ابدی کہنے لگ جائیں۔

اگر معترض یہ کہے کہ خلقت ازل سے خدا کے ذہن میں تھی اور کہ عملِ تخلیق محض اس خیال کی تکمیل تھا تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ اس سے ہمارے خیال کی ذرا بھی تردید نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس سے تو صرف لفظی تبدیلی ثابت ہوتی ہے اور ہم یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ وہ جو خالق ہونے کی قابلیت رکھتا تھا درحقیقت خالق ہوگیا۔ یا یوں کہیں کہ وہ جو خیالی طور پر خالق تھا عملی طور پر خالق ہوگیا۔ اس تمام بحث کا لب لباب یہ ہے کہ اگر خلقت پر ہونا کا اطلاق ہوسکتا ہے یعنی یہ کہ وہ نیستی سے ہستی میں لائی جاسکتی ہے تو خالق پر بھی بسبب اس تعلق کے جو وہ خلقت کے ساتھ رکھتا ہے ہونا کا اطلاق ہوسکتا ہے کیونکہ وہ بھی خالق نہ ہونے کی حالت سے خالق ہونے کی حالت میں آجاتا ہے۔لہذا معلوم ہوا کہ تجسم اور آیت "کلام مجسم ہوا" اسی بڑے بھید کا حصہ ہیں جو خدا اور خلقت سے متعلق ہے ۔ ان سے اس موجودہ راز میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

اعتراض سوم

مسئلہ تثلیث خدا کو قید مکاں میں لے آتا ہے

خدا کا تعلق جگہ کے ساتھ یا جگہ کی ماہیت کا پورا پتہ لگانا ہمارے لئے بہت مشکل ہے ۔ فلسفیوں نے اس امر کے متعلق بہت چھان بین کی ہے ۔ لیکن جگہ کی پوری تعریف یا تشریح میں ناکام رہے ہیں ۔ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ محض ایک ذہنی حقیقت ہے ۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ ہمارے تصورات کا ایک ضروری حصہ ہے ۔ لہذا اگر اس کا کوئی وجود مانا جاسکتا ہے تو وہ وجود ہمارے تصورات میں ہے ان سے باہر اس کا کوئی اپنا وجود نہیں ہے ۔ وہ درحقیقت ہمارے تصورات کا ایک ضروری عنصر ہے ۔ جگہ کی تعریف وحقیقت خواہ کچھ بھی ہو آپ پر یہ ضرور واضح ہوگیا ہوگا کہ اس تعلق کی نسبت رائے قائم کرنا جو خدا جگہ سے رکھتا ہے بالکل عبث ہے ۔ ان سوالات کا جواب دینا کہ آیا خدا جگہ میں سماجاتا ہے یا اس سے علیحدہ رہتا ہے یا یہ فیصلہ کرنا کہ آیا خدا جگہ سے اعلیٰ وبالا ہے بڑا مشکل ہے۔ ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم جگہ میں ہیں اور خدا ہمارے ساتھ تعلق رکھتا ہے ۔ لہذا ضرور ہے کہ وہ بھی کسی نہ کسی معنی میں جگہ سے تعلق رکھے لیکن اس تعلق کی ماہیت کا دریافت کرنا ہمارے دائرہ امکان سے باہر ہے ۔

اور یہ بھی معلوم کرنا کہ خدا اس تعلق کو جو وہ جگہ کے ساتھ رکھتا ہے کیونکہ ظاہر کرے گا اور کیونکر اسے استعمال کرے گا ہماری طاقت سے باہر ہے۔

لہذا اول تو ہم نے یہ دیکھ لیا ہے کہ کیونکر دنیا کو خلق کرنے اس کے ساتھ تعلقات رکھنے اور اپنے آپ کو اس پر ظاہر کرنے کی وجہ سے اپنے متعلق بار بار جگہ کے استعارے استعمال کرنے پڑے ۔ ہماری زبان اور خیالات بلکہ وہ زبان اور خیالات جو الہامی کتابوں میں پائے جاتے ہیں اس بات کو ثابت کرتے ہیں۔ کیا ایسا کرنے سے خدا خود اپنے آپ کو محدود نہیں کردیتا ؟ یعنی یہ ظاہر کرنے سے کہ وہ قید مکان میں ہے جس حال کہ وہ اس قسم کی تمام قیود اور حدود سے مبرا ہے ۔ اس نکتہ خیال سے حقیقت میں مکانی طور پر محدود ہونا یا محض محدودیت کی صورت رکھنا ایک ہی بات ہے ۔ خدا محض الفاظ "تخت "آسمان ، بھیجنا ، پیغمبر ، دیکھنا ، سننا وغیرہ کے انکشاف سے ہی جن کا اطلاق اپنے اوپر ہونے دیتا ہے ۔ اپنے آپ کہ مکانی طور پر محدود کردیتا ہے ۔ یہ تمام الفاظ جگہ اور مکان سے متعلق ہیں یہ باتیں نہ صرف مسیحیوں کے متعلق درست ہیں بلکہ اہلِ اسلام کے حق میں بھی صحیح ہیں کیونکہ وہ بھی اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ اس تخت کا ذکر کرتے ہیں جس پر خدا بیٹھا ہوا ہے اور جسے فرشتے اٹھائے رہتے ہیں اور وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ خدا کے تخت کو فرشتے آگے پیچھے اوپر نیچے چاروں طرف سے گھیرے رہتے ہیں۔ کیا انتہائی درجہ کی مکانی محدودیت نہیں ہے ؟ اور جب وہ روح کے بہشت میں داخل ہونے،خدا کی قربت میں رہنے اس کا چہرہ دیکھنے اور اس کے تخت کے پاس کھڑے رہنے کا ذکر کرتے ہیں تو کیا وہ اپنے دماغ میں جگہ صورتیں اور وسعت تصور نہیں کرتے ۔ اس کے ماننے سے بھلا کسے انکار ہوسکتا ہے ۔ لہذا ہم پھر کہتے ہیں کہ تجسّم سے علیحدہ ہی خدا نے اپنے آپ کو قید مکان میں آنے دیا کیونکہ اس نے اپنے آپ کو انسان کے خیالات اور تصورات کی چاردیواروں میں محدود ہونے دیا۔ یا یوں کہیں کہ مجسم ہونے دیا کیونکہ تجسم زیادہ وسیع معنوں میں مادی حدود میں ظہورِ الٰہی کا نام ہے ۔

(2)لیکن اگر ہم اس بات کو مانتے ہیں کہ خدا خیال میں اپنے آپ کو مکانی طور پر محدود ظاہر ہونے دیتا ہے اور جس حال کہ وہ در حقیقت اس سے کہیں اعلیٰ اور بالا ہے ایسا کہ ہم اس رفعت اور بلندی کو تصور میں بھی نہیں لاسکتے اور پھر اگر ہم اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ یہ ظاہری صورت کسی حقیقت کا ایما ہے تو ہم اس استدلال میں ایک قدم اور آگے بڑھ سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ خدا کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ بالحاظ مکان اپنی ہستی اور موجودگی کو نمایاں طور پر ظاہر کرے یعنی اس کی موجودگی کا اثر نہ صرف تصور پر پڑے بلکہ ہمارے حواس خمسہ پر بھی پڑے یا باالفاظ دیگر یوں کہیں کہ یہ ممکن ہے کہ خدا ایک خاص جگہ اپنی ہستی کی اور جگہوں کی نسبت زیادہ ظاہر کرے۔ کیا یہ خیال اس کی ہمہ جاہونے کی صفت کی تردید کرتا ہے ؟ہر گز نہیں۔ ہم عام گفتگو میں بعض سنجیدہ موقعوں پر کہا کرتے ہیں کہ ہم خدا کی حضوری کو محسوس کررہے ہیں۔ لہذا اگر خدا نے گزشتہ ایام میں اپنے آپ کو کسی غیر معمولی روشنی یا آتشی بادل یا دھوئیں کے ذریعہ اپنے لوگوں پر ظاہر کیا تو کون اس کا انکار کرسکتا ہے ۔ برخلاف اس کے کون ایسا بے عقل شخص ہوگا جو یہ خیال کرے کہ اس آگ یا روشنی نے خدا کی حضوری کو ایسے طور پر مقید کرلیا تھا کہ وہ اور کسی جگہ موجود نہ تھا۔ جب حضرت موسیٰ نے جھاڑی میں آگ کو دیکھا اور آواز کو سنا۔ جب بنی اسرائیل نے پاک ترین مکان میں آتشی بادل کو دیکھا اور سجدہ کیا اور اس طور سے عبادت کی کہ گویا وہ عین خدا کی حضوری میں ہیں۔ (اور اس نکتہ خیال کے مطابق وہ تھے بھی) تو کیا انہوں نے یہ سوچا کہ اس وقت آسمانوں کا آسمان خدا کی حضوری سے خالی تھا؟ نہیں۔ بلکہ آن کی آنکھوں کے سامنے ایک دوطرفہ راز تھا جیسا کہ تمام آسمانی

اور راز ہوا کرتے ہیں۔ (وہ کونسی چیز ہے خلق شدہ ہو یا غیر خلق شدہ جو ایک راز نہ ہو ؟) اور جس کے لئے وہ شکر گزار تھے۔

اسی طرح آپ "حضوری کے فرشتے" اور اس فرشتہ سے جس نے منوحہ سے کہا کہ میرا نام عجیب ہے (جو کہ خدا کا ایک خاص لقب ہے) نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ خدا عجیب طور پر جگہ اور وقت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اپنے آپ کو انسانی حواس پر ظاہر کرتا ہے۔

اسلام ان رازوں سے اسی قدر واقف ہے جس قدر مسیحیت ۔ ایک روایت میں ذکر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خدا کی انگلیوں کو محسوس کیا۔ لیکن اگر محسوس کرنے کی بجائے دیکھنے کا ذکر ہوتا تو کیا مبالغہ ہوگا ؟

اسی طرح ہم مسیح کے تجسم کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ وہی راز ہے جس کا ہم اوپر بار بار ذکر کر چکے ہیں لیکن مسیح میں وہ راز اعلیٰ ترین اور بہترین صورت رکھتا ہے۔ ذات الہٰی قید مکاں میں ہے اور نہیں بھی ہے۔ اس کی حضوری ایک خاص جگہ سے تعلق رکھتی ہے ۔ لیکن اس مقامی تعلق کی وجہ سے محدود نہیں ہوجاتی۔ خدا حواسِ انسانی سے پہچانا جاتا ہے لیکن تو بھی ان سے کہیں اعلیٰ و بالا ہے ۔ انکشاف پذیر ہوتا ہے پر اسی ذریعہ انکشاف کے وسیلے غائب ہوجاتا ہے ۔ یہ وہی دو پہلو راز کا قصہ کہن ہے ۔ چاہیئے کہ ہم ہر دو پہلوؤں کو قبول کریں اور سر تسلیم خم کردیں۔ شاگرد جب مسیح کے جسم پر نظر کرتے تھے تو وہ خدا کو نہ دیکھتے تھے کیونکہ ان معنوں میں کوئی بھی خدا کو نہیں دیکھتا۔ لیکن تو بھی وہ اسے دیکھتے تھے کہ جس میں "الوہیت کی ساری معموری ۔۔۔ مجسم ہو کر سکونت کرتی" ہے ۔

اب یہ کہنا کہ یہ کس طریقہ سے عملی طور پر ممکن ہوسکتا ہے یا یہ کہ خدا کے نکتہ نگاہ سے یہ معاملہ کیا حقیقت رکھتا ہے ہمارے لئے ناممکن ہے بلکہ کوئی بھی نہں بتاسکتا کہ خدا کے نکتہ نگاہ سے چیزیں کیسی نظر آتی ہیں۔

آخر میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر انسانی روح مادی نہیں تو اس کے متعلق بھی اسی قسم کے معمے اور عقدے رونما ہوجاتے ہیں۔ میری روح میرے جسم کی چار دیواری میں رہتی ہے یا یوں کہیں کہ اس میں مقید ہے ۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ وہ مد مکانی کے ماتحت ہے۔ کیا آپ میری روح کی پیمائش کرسکتے ہیں ؟ کیا آپ بتلاسکتے ہیں کہ روح کا عرض اور طور اور عمق کیا ہوتا ہے اس کی کیا شکل ہے۔ اگر وہ میرے جسم سے پرواز کرجائے تو کیا وہ اوپر کی جانب جائے گی یا نیچے کا رخ لے گی ؟ دروازے سے باہر نکلے گی یا کھڑکی کے راستہ جائے گی ؟ مشرق کی راہ لے گی یا مغرب کو سدھارے گی ؟ غرض کہاں جائے گی (الغزالی کی کتاب بنام مدنون صغیر میں انسانی روح کی اس پر راز خاصیت کی طرف ہماری توجہ مبذول کرواتا ہے اور اعتراف کرتا ہے کہ انسانی روح سے الہٰی اوصاف منسوب نہ کرنا کس قدر مشکل ہے ۔ عام طور پر انسان کے لئے ناممکن ہوتا ہے کہ وہ خدا کو تعلقات مکانی سے علیحدہ تصور کرسکے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ مشکل اس بات کا یقین دلانا ہوتا ہے کہ نہ صرف خدا بلکہ انسانی روح بھی ان تعلقات سے بلندو بالا ہے ۔ انسانی طبعیت اس حقیقت کو اس لئے باور کرنا نہیں چاہتی کیونکہ اسے وہ خدا کی ہمسری ومساوات کا دعویٰ سمجھتا ہے ۔) اس قسم کے سوالات ظاہر کرتے ہیں کہ روح کے لئے وسعت کے بحر بیکراں میں کوئی مقامی جگہ تجویز کرنا بالکل بعید القیاس ہے ۔ روح اس قسم کے تعلقات سے بالا ہے ۔ لیکن دوسری جانب ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بلاریب میری روح میرے قفسِ عنصری میں مقید ہے ۔ اس تخالف و تضاد کا کون فیصلہ کرسکتا ہے ۔ لہذا اگر ہم ان دونوں باتوں کو باوجود یکہ وہ پورے طور سے ہماری سمجھ میں نہیں آتیں درست مانتے ہیں تو وہ کونسی بات ہے جو ہمیں یہ باور کرنے سے روکتی ہے کہ اسی قسم کا تعلق خدا (جو ایک پاک ترین اور اعلیٰ ترین روح ہے) اور مادہ یا انسان میں ہوسکتا ہے یہ حقیقت دراصل ان الہٰی راز

ہائے سربستہ میں سے ایک ہے کہ جن کے سامنے ہمیں اپنی محدود واقفیت اور ذہنِ نارسا کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

اعتراض چہارم

مسئلہ تثلیث خدا کو وقت کی قید میں لے آتا ہے
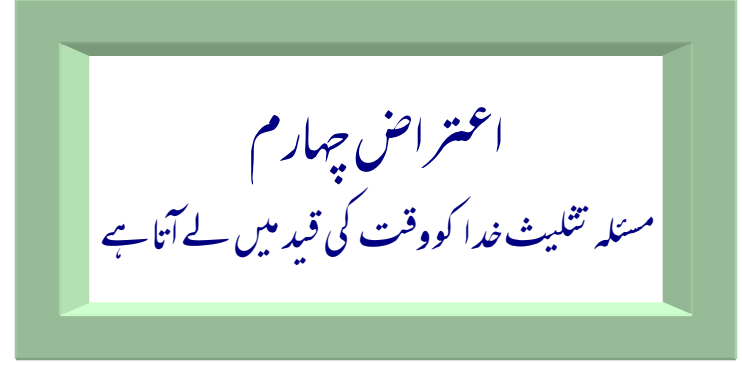
اور چونکہ وقت اور حداثت کا ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم کا تعلق ہے لہذا وقت کی قید میں لے آنا خدا کو حادث ٹھہرانا ہے۔

اس اعتراض کا جواب عنقریب وہی ہو گا جو اعتراض ماقبل کا تھا یعنی اگر اس میں کوئی مشکل ہے تووہ مشکل در حقیقت دنیا کے خلق کرنے اور اس کا انتظام قائم رکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ہر ایک شخص کو خواہ وہ مسلم، مسیحی یا یہودی ہو جو اس بات کو مانتا ہے کہ خدا نے دنیا کو ایک خاص اور واحد فعل کے ذریعہ خلق کیا اور خاص خاص افعال کے ذریعہ اسے قائم رکھتا ہے تو اس کا بھی معترف ہونا پڑے گا کہ ایسا کرنے سے خدا اپنے آپ کو وقت کی قید میں لے آتا ہے۔ وقت کی زنجیر میں اس کے اعمال، الفاظ اور خیالات خاص خاص اوقات سے تعلق رکھتے ہوئے مثل کڑیوں کے نظر آتے ہیں۔ ان پر مختلف زمانوں یعنی ماضی، حال مستقبل کا اطلاق ہوتا ہے۔ قرآن شریف میں خدا اپنے ان تعلقات کی وجہ سے جو وہ دنیا کے ساتھ رکھتا ہے بار بار وقت کے لحاظ سے محدود دکھائی دیتا ہے چنانچہ کئی جگہ اس بات کا ذکر ہے کہ خدا نے محمد صاحب کو بتلایا کہ اس نے زمانہ گذشتہ میں کیا کیا۔ زمانہ موجودہ میں کیا کررہا ہے اور آئندہ کیا کرے گا۔

الفاظ خیالات کا مظہر ہیں۔ لہذا خدا کے یہ الفاظ جو زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ خدا کے خیال میں بھی زمانہ کی تفریق وتمیز پائی جاتی ہے۔ یا یوں کہیں کہ زمانوں کا امتیاز ہماری طرح خدا کے غور وفکر کا بھی ایک ضروری حصہ ہے۔ لہذا اگر خیالات وقت کی قید میں ہیں تو صاحبِ خیالات بھی وقت کی قید میں ہے۔ چنانچہ اگر وقت اور حداثت ایک دوسرے سے ایسے وابستہ ہیں کہ جدا نہیں کئے جاسکتے تو ماننا پڑے گا کہ خدا پر بھی جس نے اپنے آپ کو ایک ایسے نظام سے پیوست کر دیا ہے جس میں وقت ایک خاص جگہ رکھتا ہے کسی نہ کسی معنی میں حداثت کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

یہ ماننے کو ہم تیار ہیں کہ اس استدلال کے ذریعہ ہم صرف نصف حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں۔ اور ہمیں یقین ہے کہ اگر حقیقت کے دوسرے حصہ سے بھی واقف ہوجائیں تو ہم دیکھیں گے کہ خدا وقت کی قید سے بالکل آزاد ہے۔ لیکن انسانی دماغ کا خواہ وہ مسلم ہو یا مسیحی اس گہرائی تک پہنچ سکتے ہیں۔ اور ہمیں یقین ہے کہ اگر حقیقت کے دوسرے حصہ سے بھی واقف ہوجائیں تو ہم دیکھیں گے کہ خدا وقت کی قید سے بالکل آزاد ہے۔ لیکن انسانی دماغ کا خواہ وہ مسلم ہو یا مسیحی اس گہرائی تک پہنچ جانا ناممکن ہے۔

لہذا ہمیں یہ شکایت ہے کہ کیوں ہمارے برادرانِ اسلام ایک مشکل کو مشترکہ ہے محض خدا کے کلمہ کے تجسم پر چسپاں کرتے ہیں کیونکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ خاص تجسم جو مسیح میں واقع ہوتا ہے وہ خدا کے اس عام ظہور سے جو دنیا کا مالک اور سرپرست ہونے کی حیثیت سے لازمی ٹھہرتا ہے کسی طرح مختلف نہیں۔ اہلِ اسلام شاید اس کا جواب دیں کہ واقعات کی طرح خدا کے الفاظ اور افعال توضرور وقت سے تعلق رکھتے ہیں لیکن خود خدا

اور اس کے خیالات پر وقت کا کچھ اثر نہیں کیونکہ یہ سب شروع ہی سے لوح محفوظ پر مرقوم ہے لہذا ازل سے خدا کے ذہن میں موجود ہیں اور ماضی حال اور مستقبل کے اطلاق سے بالکل بے خطر ہیں۔ لیکن باوجود اس تمام کوشش کے ہمارے مسلمان بھائیوں کو ماننا پڑے گا کہ دنیا کے خیالی وجود میں جو خدا کے ذہن میں ازل سے ہے اور حقیقی وجود میں جو کسی خاص وقت پر ظاہر ہوتا ہے فرق ہے کیونکہ اگر یہ فرق نہ ہو تو دنیا کو بھی خدا کے ساتھ ازلی ماننا پڑے گا ۔ لہذا اگر یہ فرق ہے تو ہمارا کہنا درست رہا کہ خدا نے خیالی دنیا کو مادی وجود دینے کے بعد اپنے آپ کو کسی غیر معمولی طریق پر وقت کی قید میں ظاہر ہونے دیا۔ لیکن اگر کوئی مسلم بھائی اور بھی زیادہ فلسفیانہ نظر سے دیکھتے ہوئے یوں جواب دیں کہ خدا کی ذات خدا کے اوصاف سے بالکل علیحدہ ہے۔چنانچہ خدا کی ذات کے اوصاف مخلوقات سے بالحاظ وقت وابستہ ہیں (مسلم ماہرین الہیات کی اصطلاح میں اسے متعلقابی کہتے ہیں)۔ لیکن یہ وابستگی اس کی تنزیح میں کسی قسم کی رخنہ اندازی نہیں کرتی۔ ہم اس کا جواب الجواب یوں دیتے ہیں کہ ممکن ہے کہ یہ فلسفہ صحیح ہو لیکن اس کا اطلاق مثل خدا کے انسان پر بھی ہوسکتا ہے ۔ انسانی ساخت کا بھی ایک پہلو ایسا ہے جو قید وقت سے محفوظ ہے ۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہو اور انسان اپنے اعمال اور خیالات کے ساتھ بذات خود بھی سلسلہ وقت میں منسلک ہوجائے تو واقعات کا علم وآگاہی بالکل نا ممکن ہوجائے اور ماضی ،حال اور استقبال کا امتیاز اٹھ جائے ۔ اور انسان خود اس درخت کی طرح جسے ایک تلاطم خیز دریا کی لہریں بیخ و بن سے اکھاڑ دیتی ہیں اور بہالے جاتی ہیں طوفان وقت میں بے ہوش اور بے خبر بہا کرے ۔ ضرور ہے کہ انسان کسی مستحکم اور استوار جگہ پر قائم ہو جہاں سے وہ ناپائداری اور تبدیلی کا ملاحظہ کرسکے۔ حلقہ وقت کے باہر کوئی ایسا مقام ہو کہ جہاں سے وقت کا علم حاصل کرسکے ۔ پس ثابت ہوا کہ اگر یہ حقیقت خدا کی نسبت درست ہے توروح انسانی کے لئے بھی صحیح ہے ۔

لیکن یہ خیال اسلامی مسئلہ توحید کو کوئی تقویت نہیں پہنچاتا بلکہ تردید کرتا ہے ۔مگر تعلیم تجسم کا بڑا معاون ثابت ہوتا ہے ۔ کیونکہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ فطرتِ انسانی میں ایک ایسا عنصر ہے جو قیدووقت سے محفوظ ہے ۔جو ذاتِ الہٰی اور ذات انسانی کے ابدی اور لامتناہی اتحاد تجسم کا موجب ٹھہرتا ہے ۔ لہذا ہم اس بحث کو یہ کہہ کر ختم کرتے ہیں کہ تجسم ایک مشکل عام کی ایک خاص حالت ہے اور بڑے بھید کا ایک خاص پہلو ہے ۔ تجسم خدا کے اس سلسلہ کارہائے تلطف وبندہ نوازی کی ایک اور کڑی ہے جس کا ابتدائی فعل تخلیق وتنظیمِ عالم ہے ۔

اعتراض پنجم

تجسم ضعف وسکون خدائے قادر مطلق کی ذات سے منسوب کرتا ہے

ہم اس اعتراض پر اس جگہ بہت وقت صرف نہ کریں گے کیونکہ اول تو ضمناً کئی بار پہلے اس کا ذکر ہوچکا ہے اور پھر اس لئے کہ ہمیں اگلی فصل میں جہاں کفارہ پر بحث ہوگی زیادہ تفصیل کے ساتھ اس پر غور کرنا ہے۔ لہذا اس وقت ہم ذیل کی چند باتوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

(1)ہم ظاہر کرچکے ہیں کہ سکون اور حرکت کا آپس میں لازم وملزوم کا تعلق ہے ۔ چنانچہ ضرور ہے کہ ایک زندہ خدا میں دونوں اوصاف موجود ہوں اور ہم نے ثابت کیا ہے مسیحی خدائے تثلیث میں ان ہر دو اوصاف کی موجودگی کے قائل ہیں۔ لہذا یہ اعتراض کہ تجسم ذاتِ خدا پر سکون کا اتہام رکھتا ہے فضول ہے ۔

(2)ہم اس نتیجے پر بھی پہنچ چکے ہیں کہ تعلق سکون اور اثر پر بھی دلالت کرتا ہے کہ خالق کے تعلقات مخلوق کے سامنے بالعموم اور عقلِ مخلوق کے ساتھ بالخصوص یک طرفہ نہیں اور نہ ہوسکتے ہیں۔ عمل جواب عمل کا ہر ایک فعل اپنے اثر کا مقتضی ہوتا ہے۔ لہذا وہ اعتراض جو تجسم پر کیا جاتا ہے تخلیق پر بھی عائد ہوتا ہے۔

(3)اس اعتراض کے جواب میں کہ مسئلہ تجسم کے ماننے سے خدا کی ذات پر ضعف اور کمزوری کا الزام لازم آتا ہے ۔ ہم پہلے ثابت کرچکے ہیں کہ عالمِ افلاکی اور عالم جسمانی میں بہت فرق ہے ۔ اور ممکن ہے کہ جو ایک عالم میں کمزوری تصور کی جاتی ہے وہ دوسرے عالم میں قوت سمجھی جائے ۔ لہذا چونکہ تجسم عالمِ اخلاقی سے تعلق رکھتا ہے اس لئے ممکن ہے کہ وہ باتیں جو خدا کے اعلیٰ درجہ کی اخلاقی قوت وقدرت پر دلالت کرتی ہوں وہ عالم جسمانی میں بشری آنکھ اور انسانی دل کو موجب کمزوری معلوم ہوں۔ لیکن "خدا کی کمزوری انسان کے زور سے زیادہ زور آور ہے ۔"

اب ہم اپنے آخری مضمون یعنی کفارہ پر غور کریں گے اور پھر اس سلسلہ میں خدا کے اثر پزیر ہونے کمزور نظر آنے اور دکھ اٹھانے کا بیان کریں گے اور اس بحث کو ان نتیجوں پر مبنی کریں گے جن تک ہم بیان ماقبل میں بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ پہنچ چکے ہیں۔

باب چہارم

خدا کفارہ دینے والے کی حیثیت میں

(1)چند عام توجہ طلب باتیں :

ہم نے بیان گذشتہ میں بار بار جتایا ہے اور اب پھر اس پر اعادہ کرتے ہیں کیونکہ یہ اہم بات ہے کہ جب آپ جسمانیت سے گزر کر اخلاقیات میں قدم رکھتے ہیں اس وقت آپ بالکل ایک نئی دنیا میں آجاتے ہیں۔ مرکز ثقل میں تبدیلی آجانے کے باعث تمام نظام میں تبدیلی آجاتی ہے اور لہذا ضروری ہے کہ ہمارے نکتہِ خیال میں بھی تبدیلی واقع ہو ورنہ ہم بڑی زبردست غلطیوں اور غلط فہمیوں کے مرتکب ہوں گے ۔

عالمِ جسمانی کا علاقہ یا تو غیر ذی جان اشیاء کے باہمی تعلقات سے ہے یا ان تعلقات سے ہے جو صاحب فکر ہستیوں اور بے جان چیزوں میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً کھیلنے والے کا عمل گیند پر اور گرتے ہوئے پتھر کا عمل کسی شخص پر۔ اس قسم کے تعلقات عالم جسمانی ہی میں نظر آتے ہیں اخلاقی دنیا سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔

لیکن جب آپ اخلاقی دنیا میں داخل ہوتے ہیں یعنی اس عالم کی سیر کرتے ہیں جہاں اخلاقی ذی جان صاحبِ ادراک اور صاحب عقل ہستیوں کے باہمی تعلقات پائے جاتے ہیں تو آپ محسوس کرتے ہیں کہ اس دنیا کی باتیں بالکل نرالی ہیں۔ جسمانی معیار یہاں کام نہیں کرتے مثلاً اگر اس عالم کی طاقت یا کمزوری کا اندازہ لگانا ہو تو آپ کو ایک بالکل نئے

اور مختلف معیار کی ضرورت پڑے گی۔ عالم جسمانی میں طاقت کی کمی وبیشی کا تصفیہ رسہ کشی ،وزن اٹھانے یا کشتی لڑنے سے بآسانی ہوسکتا ہے ۔ لیکن اخلاقیات میں ان طریقوں کو داخل کرنا کیسا مضحکہ خیز اور بعید عقل معلوم ہوتا ہے ۔

کیا اگر آپ کسی پر اپنی اخلاقی فضیلت کا سکہ جمانا چاہیں یا اس اخلاقی طور پر تسخیر کرنا چاہیں تو اپنی بڑھی ہوئی جسمانی طاقت کا کرشمہ دکھائیں گے ؟ ہر گز نہیں۔ برعکس اس کے آپ ضرور ایسے وسائل اختیار کریں گے جو شاید جسمانی عالم کے نکتہ خیال سے بالکل کمزور نظر آئیں ۔ غرضیکہ اخلاقی وسائل بہت کثیر ،متفرق ، نازک اور پیچیدہ ہیں جس حال کے جسمانی وسائل ہمیشہ قلیل اور سادہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کے حسن وقبح کا اندازہ ریاضی کے قواعد کے مطابق جسمانی قوت کے معیار سے ہوسکتا ہے ۔

اس سلسلہ میں جو بڑی غلطی اسلام نے کی ہے اور جو اسلامی اور مسیحی خیالوں میں ایک بڑی خلیج پیدا کردیتی ہے وہ یہ ہے کہ اول الذکر ان تعلقات کی تفسیر جو خدا اور انسان کے درمیان پائے جاتے ہیں جسمانی دنیا کے قواعد اور ضوابط کی رو سے کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ وہ انسانوں کو اشخاص نہیں بلکہ اشیاء تصور کریں لیکن مسیحیت انہیں اشخاص ماننے پر مصر ہوتی ہے اور اس بات پر زور دیتی ہے کہ وہ تعلقات جو انسان اور اس کے خالق میں پائے جاتے ہیں، اصولاً اور لازماً اخلاقی ہونے چاہئیں۔لہذا وہ تجاویز اور وہ مسائل جو خدا انسان کے متعلق استعمال کرتا ہے وہ نہ تو بالکل جسمانی ہیں یعنی دو جسمانی طاقتوں کا مقابلہ ،اور نہ محض عقلی ہیں کہ جس سے ایک زبردست اور ایک کمزور عقل میں باہمی جدوجہد نظر آئے بلکہ اخلاقی ہیں اور یہی وہ مقام ہے کہ جہاں بلحاظ ان اوصاف کے جو شایانِ شان خدا ہیں اور ہونے چاہئیں اسلام اور محبت میں مشرقین کی دوری حائل ہوجاتی ہے ۔ اگر آپ اس بنیادی اختلاف کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں تو باقی تمام باتیں آسانی سے سمجھ میں آجائیں گی۔ وہ بات جسے اہل اسلام کمزوری سے منسوب کریں گے اسی کو مسیحی طاقت سے تعبیر کریں گے ۔ اور برعکس اس کے وہ صفت جسے برادران اسلام طاقت تصور کریں گے مسیحی بعض حالتوں میں غایت درجہ کی کمزوری خیال کریں گے ۔ ایسی کمزوری جو ایک دیومیں اس وقت دکھائی دیتی ہے جب وہ اپنی شاہ زوری کا ثبوت ایک نازک اخلاقی معاملہ میں دینا چاہتا ہے جہاں اس قسم کی نمائش بالکل بیموقع اور بے محل ہے ۔ اس قسم کے اختلافات مسیح کی صلیب میں (نہ تجسم میں)جو دونو مذاہب کا اصلی میدان جنگ ہے انتہائی درجہ کو پہنچ جاتے ہیں۔ جسمانی خیال سے یہودیوں کی طرح اہل اسلام کی نظر میں بھی صلیب کفر ہے اور کمزوری اور شکست مجسم ہے ۔ لیکن مسیحی صلیب کو اخلاقی قوت اور فتح کا اعلیٰ ترین نشان جانتے ہیں اور اس کے طفیل یہ کہہ سکتے کہ " خدا کی کمزوری آدمیوں سے زیادہ زور آور ہے۔ یہ تو قرین قیاس ہے کہ ایک مطلق العنان بادشاہ کا سلوک اپنی رعایا کے ساتھ بالکل جسمانی اور غیر اخلاقی ہو اور وہ اپنے احکام محض جسمانی زور سے تیغ وتفنگ سے منواتا ہو لیکن کیا یہ وطیرہ یک مہذب اور اچھی سلطنت کو زیب دیگا ؟ کیا ایک باپ جو اپنی اولاد سے اپنی مرضی پوری کروانا چاہتا ہے اس قسم کے وسائل استعمال کرے گا ؟ کیا وہ پستول کے زور سے اپنے ننھے ننھے بچوں سے احکام کی تعمیل کروائے گا؟ ہر گز نہیں ۔ وہ ان طریقوں سے کبھی کامیاب نہ ہوگا۔ بہت دفعہ اسے انتظار کرنا پڑے گا اور صبر کرنا پڑے گا اور مختلف وسائل کو کام میں لانا پڑے گا۔

چنانچہ مسیحی نکتہ خیال کے مطابق خدا اور انسان کا باہمی رشتہ اس تعلق کی نسبت جو ایک حکومت اور اس کی رعایا میں پایا جاتاہے باپ اور اولاد کے تعلقات سے بہت زیادہ مشابہت رکھتا ہے ۔ ایک مطلق العنان حاکم اور اس کے غلاموں کا تو کیا ہی ذکر۔ خدا ایک

بادشاہ یا زبردست حاکم تو ہے لیکن باپ بھی ہے۔ آپ نے خدا کے متعلق لفظ "تحمل" کا استعمال کئی جگہ بائبل میں دیکھا ہوگا ہم نے بھی خدا کے دکھ اٹھانے کا ذکر کئی دفعہ اپنے بیان میں کیا ہے۔ دکھ اٹھانے میں برداشت بھی شامل ہے۔ جس سے خدا کا اثر پذیر ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ جب خدا اور انسان میں ایک اخلاقی رشتہ ثابت ہوجاتا ہے تو اس قسم کے الفاظ اور خیالات سے پہلو تہی کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ بائبل خدا کے تحمل کی طویل داستان ہے۔ اس کے صبر، برداشت اور دکھ اٹھانے کا ایک مسلسل بیان ہے۔

اگر ہم اس بات کو مان لیں کہ ایک طرف تو گناہ آلودہ اور سرکش انسان ہے اور دوسری طرف مہربان اور برداشت کرنے والا خدا ہے۔ تو ساری مشکلات حل ہوجاتی ہیں۔ یا کم از کم اس درجہ تک حل ہوجاتی ہیں جہاں تک ہماری محدود عقل کی رسائی ہوسکتی ہے۔ لہذا ہمارے نکتہ خیال سے "محبت" اور "پاکیزگی" (ان الفاظ کو ہم الفاظ " رحم " اور "انصاف" (محبت اور پاکیزگی دو بڑے وسیع المعنی اور عام الفاظ ہیں جو خدا کے اس رشتہ کے جو وہ انسان سے رکھتا ہے دو بالکل مختلف پہلوؤں کو ظاہر کرتےہیں اور ہماری سمجھ میں وہ بہترین الفاظ ہیں)پر ترجیح دیتے ہیں)ضد نہیں ہیں بلکہ حقیقتِ واحد کے دو پہلو ہیں۔ محبت اس امر کی مقتضی ہوتی ہے کہ جب تک گنہگار کی نجات کے لئے حتی الوسع کوشش نہ کی جائے آرام نہ لیا جائے۔ پاکیزگی اس بات کی طالب ہے کہ گنہگار خود اپنی خاطر پاکیزگی اور ان تمام نیکیوں اور خوبیوں کی خاطر جن سے زندگی خوشگوار ہوسکتی ہے اپنے گناہوں کا بدلہ دے اور جب تک وہ بدلہ اور فدیہ تمام وکمال نہ دیا جائے گنہگار بحال نہ کیا جائے۔ لہذا پاکیزگی حکم نافذ کرتی ہے اور محبت اس کی تعمیل کرتی ہے۔ پاکیزگی میں محبت ہے اور اسی لئے وہ اصلی معنوں میں پاک ہے۔ محبت پاک ہے اور اسی لئے محب ہے۔ ورنہ ان ہر دو اوصاف کے حصول سے کوئی فائدہ نہ ہو۔ اسی بات نے ان تعلقات کا فیصلہ کیا جو انسان اور اس خدا کے درمیان ہیں جو آسمان پر ہے۔ اور اسی بات نے اس رشتہ کو تجویز کیا جو انسان اور اس کے درمیان ہے اور مسیح میں ظاہر ہوتا ہے اور اسی نے کوہِ کلوری کی صلیب کا نظارہ دکھایا۔

ان چند عام باتوں کے تذکرہ کے بعد ہم اپنے مضمون یعنی مسیح میں کفارہ خدا پر غور کریں گے۔

خدا اور کفارہ کے متعلق مسیحی تعلیم

ہم نے بیانِ ماقبل میں بتایا تھا کہ مسیحی اور مسلم تصوراتِ خدا میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اہل اسلام خدا سے خالص اخلاقی اوصاف منسوب کرنے سے ہچکچاتے ہیں اور انہیں جسمانی عالم میں جگہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور انسان کے ساتھ تعلقات خدا کو خارجی جسمانی اور غیر اخلاقی ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن مسیحی خدا کو ایک کامل اخلاقی ہستی مانتے ہیں۔ اور یہ بھی مانتے ہیں کہ وہ تمام تجربوں میں سے گذرتا ہے جن میں سے ایک اخلاقی ہستی کو گذرنا چاہئیے۔ اور جیسا کہ اخلاقی ہستی کے لئے سزوار اپنے آپ کو ظاہر اور منکشف کرتا ہے مسیحی اعتقاد کے مطابق ایسے تجربوں اور مکاشفوں سے خدا کی شان میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوسکتی بلکہ برعکس اس کے اس قسم کے مکاشفوں سے اس کا الہٰی جاہ وجلال ظاہر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ہم نے یہ بھی دیکھا تھا اور اس وقت ہم الہٰی رعب سے مرعوب ہوئے تھے کیونکہ ہم ایک نہایت پاک اور خوفناک حقیقت پر پہنچے تھے کہ جب گناہ اس رشتہ کو منقطع

کرنا چاہتا ہے جو خدا اور اس کی روحانی مخلوق کے درمیان پایا جاتا ہے۔ تو خدا اپنے اوصاف اور اس کی نزدیکی رشتہ کے باعث ضرور متاثر ہوتا ہے۔ اس جگہ سوال اٹھتا ہے کہ وہ اثر کس قسم کا ہوتا ہے اس سے پہلے سوال کا کہ آیا خدا کا اثر پزیر ہونا ممکن ہے یا نہیں ہم جواب دے چکے ہیں اور ظاہر کر چکے ہیں کہ اسلام کو بھی ماننا پڑتا ہے کہ خدا اثر سے خالی نہیں۔

لہذا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا ہمارے گناہ سے متاثر ہوتا ہے تو اس کا بارِ ثبوت صرف ہم پر نہیں رہتا (کیونکہ خود قرآن میں اس امر کا اعتراف پایا جاتا ہے)اب جو سوال ہمارے سامنے ہے وہ صرف یہ ہے کہ خدا کس طرح سے متاثر ہوتا ہے۔ ہم بلا کسی قسم کے لیت ولعل کے کہہ سکتے ہیں کہ خدا ان معنوں میں متاثر ہوتا ہے جن معنوں میں ایک ایسی ہستی کا متاثر ہونا مناسب ہے اور ممکن ہے جو بذاتِ خود ایک اخلاقی ہستی ہے اور اپنے اخلاقی مخلوق سے اخلاقی تعلقات رکھتی ہے ۔ بائبل سے بڑے واضح طور پر ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ اور ہمیں بتلایا جاتا ہے کہ خدا اپنے گردن کش بچوں کو دیکھ کر غضب سے بھر جاتا ہے ۔ محبت کرتا ہے ترس کھاتا ہے اور رنجیدہ ہوتا ہے ۔

یہ تمام باتیں ہمارے برادران اسلام کو نفرت انگیز معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ وہ غضب اور اس سے کم درجہ پر محبت اور رحم کے جذبات کو تو خدا سے منسوب کرتے ہیں لیکن رنج کے انتساب کی برداشت نہیں کرسکتے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مشکل سے بچنے کے لئے وہ ان حیرت انگیز الفاظ میں پناہ لیتے ہیں جن کا متکلم الغزالی خدا کو بناتا ہے ۔ یعنی " ان آدمیوں کے لئے جزا ہے لیکن مجھے مطلق پروا نہیں اور ان آدمیوں کے لئے نار جہنم کا حکم ہے ۔ لیکن مجھے مطلق پرواہ نہیں:

ھاؤلآاِلے النعیمہ ولآ ابالی

ھاؤلآاِلے النارولآ ابالی

ہم اپنے مسلم بھائیوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا اس قسم کی باتیں ہمارے الہیات میں کوئی قابلِ قدر اضافہ کرتی ہیں یا ہمیں ملحد اور بے خدا بنادیتی ہیں ؟اس قسم کے ایمان کش الفاظ سے مسلم تصورِ خدا کا پول کھل جاتا ہے اور ہم بے دریغ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ایسے خدا سے محبت رکھنا اور اس کی اطاعت کرنا ناممکن سمجھتے ہیں کیونکہ ہمارے خیال میں ایسے آسمانی خدا کی نسبت دنیا کا ایک راستباز شخص بہتر اور اعلیٰ تر اوصاف سے متصف ہوتا ہے۔

فلسفہ اور الہام دونو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا سے گنہگار اور سرکش انسان کی نسبت غضب ،رحم ، محبت اور رنج کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور کہ یہ تمام ایک ہی بات کے مختلف پہلو ہیں۔ مثلاً یہ غضب کسی ناراض شدہ متعفن یا خشم آلودہ حاکم کا غضب نہیں۔ بلکہ یہ اس باپ کا غضب ہے جو ناراستی سے خوش نہیں ہوتا۔ یہ اس کی پاکیزہ ہستی کا اظہار ناخوشی ہے جو ناپاکی کی بالکل برداشت نہیں کرسکتی۔ ایسی ناراضگی کی دنیاوی مثالیں بھی مل سکتی ہیں۔ مثلاً ایک راستباز باپ اپنے بیٹے کے گناہ آلودہ اور شرمناک کاموں سے جو اس کی عزت کو خاک میں ملانے کا باعث ہوتے ہیں غضب میں بھر جاتا ہے یا ایک راست گو شخص اپنے دوست کے فریب کو دیکھ کر قہر اور غضب کے مارے بے چین ہو جاتا ہے یا ایک پاک دامن خاتون کسی ناپاک شخص کے بیہودہ الفاظ یا حرکات کو دیکھ کر غصہ اور غضب سے بھر جاتی ہے ۔ کیا ان تینوں حالتوں میں ایسا غضب نہیں نظر آتا جو جلتے ہوئے تنور کی طرح بھسم کرنے کو تیار ہو اور جس کی حرارت اور تپش کی مجرم تاب نہ لاسکتا ہو اور جس کے سامنے یہی آرزو رکھتا ہو کہ زمین پھٹ جائے اور اسے نگل جائے یا کوئی غیبی ہاتھ اسے پردہ تاریکی میں چھپالے ؟

جب انسانی غضب میں یہ طاقت ہے تو الٰہی غضب میں کتنی طاقت ہو گی؟ خیال رہے کہ ان حالتوں میں ایک اخلاقی جذبہ پایا جاتا ہے یا یوں کہیں کہ ایک اخلاقی ہستی کا تجربہ اور اس کا اظہار ہے یہ کسی غضب آلودہ حاکم کا غصہ نہیں نہ کسی دل جلے منتظم کا قہر ہے۔ اور نہ ہی یہ کسی زبردست مشین کا جسمانی انتقام ہے جسے انسان نے کسی طرح ناخوش کیا ہے بلکہ یہ ایک پاک اور مقدس خدا کا بھسم کردینے والا غضب ہے۔ محبت اس جلتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کرتی ہے۔ بائبل مسیح کے ذریعہ خدا کے قہر اور غضب کی یہی تفسیر پیش کرتی ہے کہ روزِ عدالت گنہگاروں اور ناراستوں پر غضب الٰہی کا وہی اخلاقی اثر ہو گا جو بدمعاشوں اور سرکشوں پر اس دنیا میں بھی ہوتا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا تین مثالوں سے ظاہر کیا جاچکا ہے۔ محبت اور پاکیزگی کی وہی آگ جو قیامت کے دن بہت سے بندگانِ خدا کے چہروں کو منور کرے گی بہتوں کے لئے نارِ جہنم کا حکم رکھے گی۔

غضب کے متعلق ہم اسی پر اکتفا کریں گے۔ ہم اپنی محدود دماغی قابلیت کی وجہ سے مجبور ہو کر خدا کے ایک ہی جذبہ کے کئی ایک مختلف نام رکھ دیتے ہیں اور محبت رحم اور رنج کو متفرق بلکہ متضاد وجذبات تصور کرتے ہیں۔ گو وہ ہمارے تجربہ میں بھی علیحدہ علیحدہ آتے ہیں لیکن ممکن ہے کہ ایک حقیقت کا اظہار ہوں۔ ہمارا مطلب شاید صاف ہو جائے گا اگر ہم ایک ماں کی ذہنی کیفیت کا تصور کریں جس کا بیٹا بدکار فریبی اور دروغ گو ہو تو اس کے دل میں اس بیٹے کے لئے غصہ ترس محبت اور رنج کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ گو یہ جذبات ایک ہی وقت میں موجود نہ ہوں۔ لیکن ایک دوسرے سے ایسے ملے جلے ہوں گے کہ انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ناممکن ہو گا۔ خدا میں یہ جذبات ایک ہی وقت میں موجود نظر آتے ہیں۔ اور ان کا سمجھنا اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب ہم ان پر ایک مجموعی نظر ڈالیں۔ محبت وہ زبردست تمنا ہے جو انسان کی بحالی کی ہر وقت آرزومند رہتی ہے۔ ترس انسان کی گری ہوئی اور مصیبت زدہ حالت کا علم ہے۔ رنج محبت کے بے قدری اور بے پرواہی سے پیدا ہوتا ہے یا یوں کہیں کہ زخم خوردہ محبت کا اظہار ہے۔ غضب کا بیان ہم پہلے کرچکے ہیں۔ اگر خدا اپنی انتہائی رفعت اور بلندی پر اس قسم کے اثرات سے موثر نہیں ہوتا تو وہ خدا ہماری پرستش اور عبادت کا مستحق نہیں۔ لیکن حضرت یسعیاہ، حضرت ہوسیع اور حضرت یرمیاہ اور بالخصوص حضرت یونس کی کتابوں کے مطالعہ سے کامل ثبوت مل جاتا ہے کہ میرے اور ہر ایک گنہگار کے لئے اسی قسم کے جذبات اس کے دل میں پائے جاتے ہیں اور مسیح میں ان جذبات کا پورا اظہار ہوتا ہے۔

اب ان خیالات کو تعلیم کفارہ پر منطبق کیجئے۔ ہم اس نتیجہ پر تو پہنچ چکے ہیں کہ تجسم خدا کے اس تلطف آمیز انکسار کا ایک پہلو ہے جو دنیا اور بالخصوص انسان کے ساتھ تعلق رکھنے اور اس میں رہائش پزیر ہونے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اب ہم یہ ثابت کریں گے کہ کفارہ خدا کے ان خیالات اور جذبات کا جو وہ گنہگار انسان کے متعلق رکھتا ہے کلمہ مجسم میں ایک خاص ظہور ہے یا بالفاظ دیگر الٰہی رنج، ترس، غضب اور محبت کے مسیح مجسم میں ظاہر ہونے کا نام کفارہ ہے۔ جس طرح تجسم جوہر ازلی کا وہ ظہور ہے جو وقت اور جگہ سے تعلق رکھتا ہے اسی طرح کفارہ خدا کے ازلی صبر کا جو شروع سے گناہ کا متحمل ہے جگہ اور وقت سے تعلق رکھتا ہوا عملی ثبوت ہے۔

مسیح کے دکھ درحقیقت خدا کے دکھ ہیں جو وقت اور جگہ کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ اور غضب محبت ترس رنج اور صبر جو مسیح میں پائے جاتے ہیں وہ خدا میں بھی پائے جاتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ خدا میں وہ وقت اور جگہ کی قید میں نہیں ہوتے لیکن مسیح میں وہی

جذبات وقت اور جگہ سے علاقہ رکھتے ہیں۔ تجسم کہتاہے کہ "خدا نے مسیح میں ہو کر" اور کفارہ اسے یوں ختم کرتاہے کہ " اپنے ساتھ دنیا کا میل ملاپ کرلیا۔"

لہذا مسیح کے کام جووہ اپنی جسمانی حالت میں کرتاہے خدا کے کام ہیں جو جگہ اور وقت کے تحت میں ظاہر ہوتے اور انسان سے نزدیکی تعلق رکھتے ہیں۔ لہذا مسیحی تعلیم پر یہ الزام لگانا کہ وہ خدا کو ایک سخت اور قہر آلودہ باپ اور مسیح کو ایک پیار کرنے والا اور نرم دل بیٹا ظاہر کرتی ہے حقیقت سے بعید ہے ۔ بائبل تثلیث کے اقانیم سے جدا گانہ کام منسوب کرنے کے باوجود بھی خدا کی ذات میں کسی قسم کی تقسیم کی تعلیم نہیں دیتی۔

محبت اور نجات کے فعل واحد میں دکھ اٹھانے کے ذریعے واقعہ ہوتاہے باپ بیٹا اور روح ایک ہی ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ کلام میں آیا ہے کہ " خدا نے جہان کو ایسا پیار کیا ،خدا نے مسیح میں ہو کر" خدا اپنی محبت کی خوبی پر یوں ظاہر کرتاہے۔"

چنانچہ ثابت ہوا کہ کفارہ ایک ایسا فعل ہے کہ جس کا فاعل خود خدا ہے۔ کفارہ کوئی خارجی عمل نہیں کہ جس کا معافی حاصل کرنے کے لئے پہلے سرزد ہونا لازم تھا۔ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ سوائے اس پر محبت خدا کے جو ازل سے گناہ کا بوجھ اٹھاتا رہا اور جس نے مجسم ہو کر وقت کے تحت میں بھی انسان کے گناہ کا بوجھ اٹھایا ۔ اور کوئی گنہگار انسان کو معافی اور نجات نہیں دے سکتا ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس کے اقبال سے گریز نہیں ہوسکتا ۔ گو اس میں شک نہیں کہ ہماری نجات کا وسیلہ مجسم بیٹے کا کفارہ ہے جو مسیح میں پیش کیاجاتاہے لیکن یہ کوئی ایسی تجویز یا ترکیب نہیں ہے کہ جس کے ذریعہ ہم خدا کو اس بات پر آمادہ کرتے ہیں جسے وہ خود کرنا نہ چاہتا تھا بلکہ یہ الہیٰ ذہنی کیفیت کا ایک عملی اظہار ہے جس کے بغیر ہماری نجات ناممکن تھی۔ اس قسم کی عبارت کہ اگر کفارہ نہ ہوتا تو ہم نجات نہ پاسکتے ۔ درحقیقت یہ معنی رکھتی ہے کہ اگر ایسا خدا نہ ہوتا کہ جو نجات دہندہ بھی ہے تو ہم ہر گز نجات نہ پاسکتے ۔ چونکہ خدا ایک محبت کرنے والا خدا ہے اس لئے ناممکن تھا کہ وہ گناہ کا بوجھ نہ اٹھاتا۔ غم زدہ نہ ہوتا۔ اپنے کلمہ میں مجسم نہ ہوتا۔ مجسم ہو کر دنیا میں گناہ سے جنگ نہ کرتا اور گناہ کے سبب سخت دکھ نہ اٹھاتا ایسی موت نہ گوارا کرتا جو سخت روحانی پریشانی اور جسمانی عذاب کا باعث ہوئی۔

اب ہم اس بڑے بھید سے کچھ واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کریں گے ۔

مسیح اس دنیا میں محض روحانی اسلاح سے مسلح ہو کر آتے ہیں اور گناہ کا مقابلہ راستی اور روح کے ہتھیاروں سے کرتےہیں ۔ اور جسمانی یا فوق الفطرت ذرائع کے استعمال سے بالکل پرہیز کرتے ہیں ۔ آزمائش کے وقت وہ موخر الزکر وسائل کے استعمال سے انکار کرتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے اس دنیا کے اسلامی خیالات کو خیر باد کھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اخلاقی نتائج محض وسائل سے پیدا ہوتے ہیں ۔ لہذا وہ ان جسمانی طاقتوں کو جن پر وہ پورے طور پر حاوی تھے مطلق کام میں نہیں لاتے ۔سوائے منجی جہان کے اور تمام اشخاص کے لئے جن میں انبیاء بھی شامل ہیں یعنی خاص خاص حالات میں جسمانی ذرائع کا استعمال جائز سمجھا گیا ہے لیکن شافعِ عالم کا اس قسم کے وسائل کے ساتھ کچھ سروکار نہ تھا۔

ہمارے مسلم بھائی اس امر کا غایت درجہ کی کمزوری سے منسوب کرتے ہیں۔ لیکن وہ شخص جو اخلاقی طاقت سے بخوبی واقف ہے ہر گز اسے کمزوری نہیں سمجھتا بلکہ انتہائی درجہ کی قوت تصور کرتاہے ۔ لہذا وہ جنگ جو مسیح اور گناہ کے درمیان ہوئی اخلاقی جنگ تھی۔ اس جنگ میں کوئی خارجی ہتھیار استعمال نہیں کئے گئے ۔ اگر وہ گتسمنی کے باغ میں فرشتوں کی فوج کو اپنی کمک کے لئے منگوالیتا یا اگر وہ صلیب پر اپنی الہیٰ طاقت سے کام لیتا --------- اور اتر آتا۔ یا اگر وہ بادشاہ وقت کی معاونت سے فائدہ اٹھاتا تو یہ

جنگ اخلاقی جنگ نہ رہتی۔ اور غیر اخلاقی عنصر کے داخل ہوجانے کے سبب انسان کی اخلاقی نجات ناممکن ہوجاتی ۔ شیطان کے سر پر زخم کاری نہ لگتا اور گناہ کو شکست فاش نہ ملتی ۔ لہذا اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس نے اپنے دشمنوں کومقابلہ نہ کیا۔

اس نے دنیا کے گناہوں کو اجازت دی کہ اس کی پوری مخالفت کرلیں۔ اس نے اجازت دی کہ گناہ اپنے نتائج اس میں جو بے عیب اور مقدس تھا ظاہر کرے اور ہمیشہ کے لئے اپنی اس فطرت اور اصلیت کو ثابت کردے جو خدا اور راستی سے نفرت کرتی ہے اور پاکیزگی اور نیکی کی بربادی سے خوش ہوتی۔

لیکن ضرور تھا کہ وہ ایسا کرنے سے پیشتر موت کی وادی میں سے گذرے ۔ لیکن اگر وہ موت قبول نہ کرتا تو گناہ کی ماہیت کا پورا اندازہ کبھی نہ لگ سکتا اور کبھی اس کے نتائج سے پوری واقفیت نہ ہوسکتی۔ گناہ کے ماہیت کوظاہر کرنے کے لئے ضرور تھا کہ وہ اس ماہیت کی برداشت کرتا یعنی اس خواہش کو جو نیک اور نیکوں کی دشمن ہے ظاہر ہونے دیتا اور اس کے نتائج کو ظاہر کرنے کے لئے ضرور تھا کہ وہ ان نتائج کی برداشت کرتا ،یعنی سخت دکھ اور تکلیف کی موت مرتا۔

اور یہ ظاہر ہے کہ اگروہ ان تمام منازل سے نہ گذرتا تو کبھی فتح یاب نہ ہوتا۔ جب گناہ اپنی تمام کوششیں کرچکتا ہے تب خداوند ثابت کرتا ہے کہ گناہ کی تمام مساعی بالکل رائیگاں ہوئیں۔ لیکن اگر شروع ہی میں فتح ہوجاتی توکھنے کی گنجائش رہ جاتی کہ گناہ نے اپنی تمام طاقت کو استعمال نہیں کیا تھا۔

انسان اسی وقت شکست خوردہ تسلیم کیاجاتاہے جب وہ اپنی طاقت کو کام میں لاچکتا ہے۔ گناہ کی آخری طاقت موت تھی لہذا موت سے پیشتر گناہ پر شکست کا فتویٰ نہیں لگ سکتا تھا۔ موت کے بعد گناہ نے شکست فاش کھائی۔ لہذا مسیح نے پورا غلبہ حاصل کرنے کی عرض سے عارضی طور پر اپنے آپ کو گناہ اور موت (پس کیا خدا مرگیا ؟ اس سوال میں ایک دروغ گوئی اور ایک منطقی غلطی پائی جاتی ہے. خدا روح ہونے کی حیثیت میں کبھی مر نہیں سکتا . اکثروں کا یہ خیال بھی ہے کہ ہماری روحیں بھی نہیں مرسکتیں. لیکن وہ شخص جس میں روح اور جسم دونو پائے جاتے ہیں مرسکتا ہے یعنی اس کے جسم اور روح میں جدا ئی ہوسکتی ہے لہذا یہ کہنا کہ خدا یا کلمہ خدا مرگیا سراسر غلطی ہے . لیکن وہ مجسم کلمہ جسے مسیح کہتے تھے مرگیا . یعنی اس مجسم خدا کی روح اور اس کے جسم میں جدا ئی ہوگئی.)
کے حوالے کردیا۔ یوں دنیا کی نجات کا کام تمامی تک پہنچا۔ وہ گنہگار جو کفارہ پر ایمان لاتاہے وہ گناہ کو اس کے اصل رنگوں میں دیکھتاہے اور اسے اپنا دشمن تصور کرتاہے۔ اور اسے خدا کی طرح نفرت کی نگاہ سے دیکھتاہے۔ خدا گنہگار انسان کو معاف کرنے سے کسی غیر اخلاقی فعل کا مرتکب نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی ذات کے تقاضا سے ہی انسان کو گناہ کی طرف سے موت اور پاکیزگی کی طرف سے ایک نئی زندگی دیتاہے۔ البتہ ایسے گنہگار کو جو اپنے گناہوں میں بدستور مگن ہے اور جس کا دل اسی طرح گناہ آلودہ ہے معاف کرنا اخلاقی گناہ ہے اور ایسا کرنا گویا اس ازلی پاکیزگی کے ارکان کو جن پر تمام دنیا بلکہ ابدیت قائم ہے مسمار کردیناہے۔

ہم کہہ سکتےہیں کہ صلیب نے گناہ کا احساس ہم میں پیدا کردیا ہے اور اب ہم گناہ سے نفرت کرسکتےہیں۔ اور نفرت کرنے کی وجہ سے گناہ سے نجات پاسکتے ہیں۔ صلیب پر انسانی ذہنیت گناہ کے متعلق الہٰی ذہنیت کے مطابق ہوجاتی ہے اور الفاظ "مسیح کا خون ہمیں ہر قسم کی ناپاکی سے صاف کرتاہے " کا مفہوم بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے ۔ ان معنوں میں مسیح کا خون انسان کے دل ضمیر کو صاف کردیتاہے اور اسے پیغام معافی

سناتاہے ۔ کیونکہ انسان خدا کی طرح خود بھی اپنے گناہوں سے متنفر ہوجاتاہے ۔ گنہگار انسان کو نہ صرف معافی ہی ملتی ہے بلکہ اس کے گناہ اس سے جدا کئے جاتےہیں اور وہ خدا کے سامنے صادق ٹھہرتاہے اور پھر خدا کی قربت اور محبت حاصل کرتا ہے۔ اور اب اسے خدا کی حضوری میں اطمینان اور تسلی ہے کیونکہ اس کے اپنے دل میں چین اور تسکین ہے اور چونکہ اس کی خدا کے ساتھ صلح صفائی ہے اس لئے وہ اپنے آپ سے بھی مطمئن ہے ۔
یہ خدا کی کامل پاکیزگی کا تقاضا تھا کہ وہ ازل سے مسیح میں ہو کر دکھ اٹھائے اور ایسی بڑی قیمت انسانی مخلصی کی ادا کرے اور یہ اس کی کامل محبت ہی کا کام تھا کہ اس انتہائی دکھ اور مصیبت کی برداشت کرے۔ لہذا صلیب وہ جگہ ہے جہاں پاکیزگی اور محبت غضب اور ترس عدل اور رحم ایک دوسرے سے ملتے اور بوس وکنار ہوتےہیں۔